سلسلۂ اشاعت نمبر 5

حضرت غفرانمآبؒ
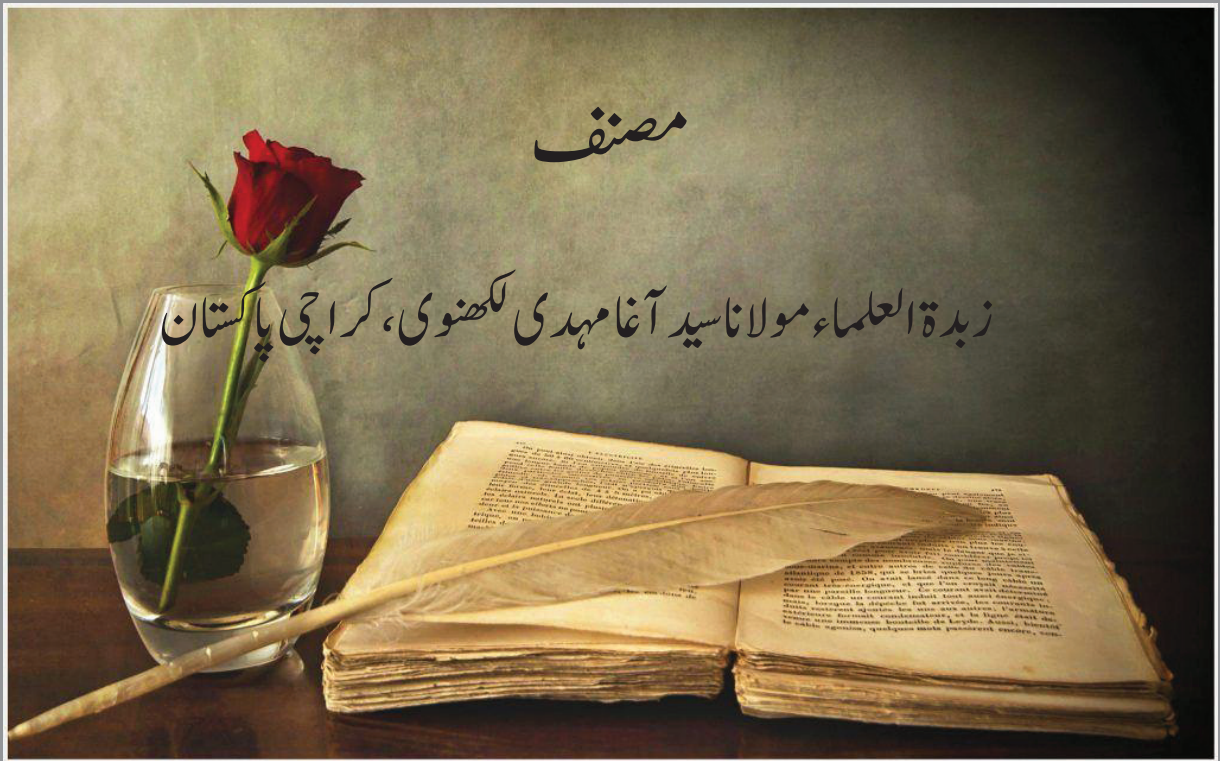
ناشر

ڈیجیٹل لائبریری آف نور ہدایت فاؤنڈیشن

امام باڑہ غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳ (یوپی) انڈیا

نام کتاب: حضرت غفران مآب رحمۃ اللہ علیہ

مصنف: زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی لکھنوی کراچی پاکستان

تاریخ وسنہ اشاعت (آنلائن) ۱۳؍نومبر ۲۰۱۹ء

ناشر: ڈیجیٹل لائبریری آف نور ہدایت فاؤنڈیشن

مدیر: سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی

نائبین مدیر: سید قائم مہدی نقوی تذہیبؔ نگروری

فیروز علی کوپا گنج مئو (تزئین کار)

عظمت علی مبارکپوری

امام بارہ غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک،
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳ (یوپی) انڈیا

عرض نور

علم وادب کی دنیا میں 'ماہنامہ' کی اپنی ابلاغی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ 'جلد بازی کے ادب' صحافت میں ایک حد تک استقامت کا رنگ بھر کر اسے علمی وادبی متانت کا قابل توجہ بنا دیتا ہے اور 'کتابی' انداز کی پذیرائی اور یادگاری کے قریب تر کر دیتا ہے۔ کچھ یہی وجہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں علمی وسائنسی تحقیقی مجلوں میں ماہنامہ کا غلبہ قائم ہے۔ ایسے مجلّے عموماً اختصاصی ہو گئے ہیں اور اپنے معیار ومقدار کے لحاظ سے بڑے معتبر وموقر ہو چکے ہیں۔

دینی وملی ماہنامہ جو بنیادی طور پر اختصاصی ہوتے ہیں، ان کی بھی اپنی روایت رہی ہے اور اپنا خاص مقام۔ اردو زبان میں برصغیر ہند میں ایسے ماہناموں کی تاریخ قدیم بھی ہے اور درخشاں بھی۔

ماہنامہ 'شعاع عمل' ایسے ماہناموں کی صف میں شامل ہونے والا نسبتاً تازہ اضافہ ہے۔ پھر بھی یہ اپنی اشاعت کی 'صدی' برسوں پہلے مکمل کر چکا ہے اور 'دوسرے عشرہ' کی تکمیل کی طرف اپنے استقلال کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس 'کم عمری' میں اپنے نمود اور بلوغ نظر کے جھنڈے گاڑ چکا ہے۔ ساتھ ہی کئی جہات سے اپنے امتیازات اور خصوصیات ثبت کر چکا ہے۔ 'شعاع عمل' میں ابتدا سے معیاری علمی وتحقیقی مشمولات کے ساتھ 'یادگاری' کا عنصر نمایاں رہا ہے۔ علم وقلم کی نوابغ روزگار ہستیوں کی یادگار زمانہ مضامین کے ساتھ اس کا ہر شمارہ یادگار اور قابل قدر رہا اور مقبول عوام وخواص بھی۔ اسی یادگاری کے عنصر کے پیش نظر اس کے مطبوعہ ومطبوع عام معیاری مضامین کو ایک ایک کر کے سرِ دست نور ہدایت فاؤنڈیشن کی آن لائن ڈیجیٹل لائبریری سے سالکانِ راہ تحقیق کے لئے شائع کیا جا رہا ہے

زیر نظر پیش کش بھی مذکورہ بالا سلسلہ کی پانچویں کڑی ہے جس کا موضوع حضرتِ غفران مآبؒ ہیں۔ جس کے مصنف زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی لکھنوی کراچی پاکستان ہیں۔

امید ہے، ہمارے اہل ذوق ونظر قارئین کرام ہماری اس پیش کش کو بھی شرف قبولیت اور ہمیں اپنے مفید آرا سے نوازیں گے۔

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی

دبیر مؤسسۂ نور ہدایت، لکھنؤ

حضرت غفران مآب رحمۃ اللہ علیہ

زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی لکھنوی، کراچی پاکستان

یا غفران یا رضوان

''ملت جعفریہ کے مشہور علماء شیخ صدوق، شیخ مفید، میر باقر داماد، بہاؤالدین عاملی، مجلسی، بحرالعلوم وغیرہ اعلے اللہ مقامہم اور دوسرے شیعہ مشاہیر مجتہدین کے حالات مدرسۃ الواعظین کے آرگن الواعظ لکھنؤ سے نشر کرنے کے بعد آج خود اپنے جد امجد اور مورث اعلیٰ حضرت غفران مآبؒ کے احوال پر قلم اٹھانے کا فخر حاصل کر رہا ہوں جن کی بلند شخصیت سے قوم اچھی طرح متعارف ہے، انہیں کی ذات تھی جس نے آج سے دوسو برس قبل کے عوام کو ان کی بہائم صفت زندگی کا احساس پیدا کر کے انسان بنایا اور کامل ۳۵ سال تک اس سحاب علم کے ترشحات سے قوم سیراب ہوتی رہی اور ان کی آنکھ بند ہونے کے بعد آج تک ان کی نسل میں علم و حکمت کے تجلیات جگمگاتے رہے اور اہل علم میں جو ہے وہ انہیں کے خرمن فیوض کی خوشہ چینی کر رہا ہے''

فقیر باب اہلبیت
آغا مہدی لکھنوی
۸ر شعبان ۱۳۸۳ھ

عالم کی ضرورت اوراس کا خدا کے نزدیک مرتبہ

منعم حقیقی کا ہم پر یہ رحم وکرم ہے کہ سلف سے آج تک ہر زمانہ میں ایک مجتہد جامع الشرائط عوام کے رشد وہدایت کے لئے آتا رہا اور ہر راہ نما وہ نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ گیا جو زمانہ کی سرد وگرم ہواؤں سے فنا نہیں ہو سکے۔ اس نعمت عظمیٰ کی افادیت کا اعتراف سرسید احمد خاں آنجہانی المتوفی ۱۸۹۸ء نے اپنے ایک مضمون میں بڑے لطف سے کیا ہے:

''مذہب شیعہ امامیہ[1] کا نہایت صحیح اور سچا مسئلہ ہے کہ ہر زمانہ میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے''۔ غفران مآبؒ بارہویں صدی کے وہ عالم ربانی تھے جنھوں نے وطن سے بچپن میں نکل کر علم وعمل کی لازوال دولت حاصل کی اور اس قابل ہوئے کہ باب مدینۂ علم کے مزار مبارک پر مدت دراز تک جبہہ سائی کی اور فقہ واصول کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علمائے نجف اشرف وقم وحجاز کے فیوض سے مالا مال ہو کر لکھنؤ کو فقہ جعفری کا مرکز بنایا اور ملک وملت کے فلاح وبہبود کا اساس قائم کیا وہ اب بھی زندہ ہیں'' ؎

مَوْتُ التَّقِيِّ حَيَاتُ لَانَفَادَ لَهَا
قَدْمَاتَ قَوْمٌ وَهُمْ فِي النَّاسِ اَحْيَاءُ[2]

پرہیزگار کی موت وہ زندگانی جاوید ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ لوگ مرتے رہتے ہیں مگر

---

[1] رسالہ تہذیب الاخلاق، ص ۶۹ مورخہ ۱۰ر محرم ۱۲۸۹ھ

[2] یہ شعر ابو محفوظ کرخی شاعر عرب کا ہے جو مجانی الادب فی حدائق العرب تالیف نویس شیخو طبع بیروت ۱۹۰۹ء میں موجود ہے۔

متقی مرنے والا گروہ مردم میں زندہ ہے۔[1]

حدیث میں ہے، پل صراط پر جب عالم و عابد ایک ساتھ ہو جائیں گے تو عابد سے کہا جائے گا کہ داخل بہشت ہو اور اپنی عبادت کا پھل حاصل کر اور عالم سے حکم ایزدی ہوگا، تم اسی جگہ ٹھہرو اور جس کی چاہو شفاعت کرو جس کی سفارش کرو گے وہ بخش دیا جائے گا۔ عالم کا قیام انبیاء کی جگہ پر ہوگا۔

فریقین کی مسلمہ حدیث ہے کہ سرکار دو عالم نے اہل علم کے لئے فرمایا:

''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاؑ کی طرح ہیں''[2]

عوام کے لئے اس حدیث میں تشبیہ کا پہلو، ان سے رجوع اور ان کی عزت کرنا ہے نہ یہ کہ اہل علم کو نبی سمجھا جائے جیسا کہ قادیانی فرقہ استدلال کرتا ہے وجود نبوت پر۔ اس کو نہیں معلوم کہ تشبیہ میں جس سے تشبیہ دی جائے ہرگز اس کے تمام پہلو مدنظر نہیں ہوتے۔ خوبصورت کو چاند کہنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس میں طلوع، غروب، گھٹنا، بڑھنا اور کرویت تمام باتیں پائی جائیں۔ اس قسم کا سہارا مضحکہ خیز ہے جس کو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ علم کی فضیلت میں بعض اہل قلم نے ایک جذبہ کا استثناء کیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہم کسی دولت مند کی برابری کی آرزو کریں تو یہ ہوگا حسد۔ مگر علم میں ترقی کر کے کسی بلند پایہ عالم کے درجۂ کمال تک پہنچنے کی آرزو حسد نہیں ہے، جمیل ہے۔[3] ان حقیقی علماء کے بارے میں ہے ''اَلرَّادُّ عَلَيۡهِمۡ كَالرَّادِّ عَلَيۡنَا'' معصوم فرماتے ہیں جس نے مجتہدین کو ٹھکرایا اس نے

---

[1] قِفۡ هٰهُنَا فَاشۡفَعۡ لِمَنۡ اَحۡبَبۡتَ فَاِنَّكَ لَا يُشۡفَعُ لِاَحَدٍ اِلَّا شَفَعۡتَ فَقَامَ مَقَامَ الۡاَنۡبِيَاءِ (تفسیر روح البیان بروسوی سورۂ صافات، صفحہ ۴۵۵ طبع مصر)

[2] تفسیر روح البیان، فاضل بروسوی، جلد اول، ص ۲۴۸، طبع مصر، صفات المرأۃ شرح مراۃ العارفین، ص، ۲۹۷

[3] مَجَانِيُ الۡعَرَبِ فِي حَدَائِقِ الۡعَرَبِ، ص ۴۶ طبع بیروت

گو یا ہماری مخالفت کی۔آجکل کی اکثریت کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ جس نے منبر پر سب سے اچھی مجلس پڑھی وہ زیر منبر آنے کے بعد مولانا ہوگیا خواہ صحیح عربی عبارت نہ پڑھ سکے، قرآن کی آیتیں غلط پڑھے۔اس طبقہ کے کردار کو عالم اور مجتہد کا رویہ قرار دے کر صف علماء کی تذلیل وتحقیر ہوتی ہے اس کا نام عراق میں روضہ خواں اور لکھنؤ میں ذاکر ہے۔

نواب آصف الدولہ مرحوم کے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ بسانے پر ہر طرف سی صاحبان کمالات کھینچ کھینچ کر آرہے تھے اور بہت تھوڑے عرصہ میں فنون لطیفہ اور ارباب نشاط ہر طرف سے سمٹ آئے۔ دولت و مطلق العنانی کا اجتماع بغیر نتائج بد کے ضمیمہ کے کیوں کر ممکن تھا؟ مسلمانوں کی یہ حالت ہوئی کہ مادیت کا اگر ایک بادل ہٹا تو اس کی جگہ دوسرے بادل نے لی اور مہاجرین "از دام جستہ سوئے دام می رود "کا مصداق بن گئے۔احمد کبیر[1] کی گائے، شیخ سدو کا بکرا، ہٹیلے کا مرغ،[2] بی بی گرج کا روٹ، میاں جلال کے کونڈے، مدار صاحب کی انکھیاں،[3] اور بھنگ نوشی کی دعوت عام تھی۔صوفیت کے پرشکوہ ایوانوں میں گیروے لباس سے ملبوس رہنما صرف ''یاحق'' کی صدا کو واحد عبادت قرار دئے ہوئے، نماز وروزہ سے غافل، ہاتھ میں طوطی کا پنجرا جو پناہ بخدا ان کے عقیدہ حلول وتحلیل کی بولتی ہوئی تصویر یا کردار پر خاموش گواہ تھا۔ اس ماحول میں شہر سے ۳۵ کوس دور مضافات[4] الہ آباد کے دیہات نصیر آباد کی خاک نے منجملہ اور پیمبران حقیقت شناسی کے علامہ سید دلدار علی کو پیدا کیا جس نے انسانیت کو سدھارنے کا بیڑا اٹھایا اور فقہ جعفری کی حفاظت کی۔

---

[1] اہل طریقت کے ایک ولی جن کا وصال ۲۷۵ھ میں ہوا اس نیاز کا ذکر تحفۂ جعفری صفحہ ۲۷ میں دیکھو۔

[2] منہ

[3] صفحہ ۳، منہ بہار ہند صفحہ ۲۱۵ / مرزا مچھو بیگ

[4] انگریزوں نے رائے بریلی ضلع قائم کر کے نصیر آباد کو علاقہ الہ آباد سے الگ کیا۔

آپ کے اجداد کا خدمت خلق میں ایک پرشکوہ اقدام

سلطان ابراہیم شرقی کے زمانہ حکومت کا ذکر ہے، رائے پرتاب سنگھ بہادر کی لڑکی بیاہ کر سسرال جانے والی تھی کہ کچھ لٹیروں نے برات پر چھاپا مارنا چاہا اور جان وآبرو کا خوف ہوا۔ لڑکی والوں کو سادات کے کردار اور غیرت کا یقین تھا اور وقت مصیبت میں ان کو کچھ نہ بن پڑا سوائے اس کے کہ عورتوں کو عصمت دری سے بچانے کے لئے ان حضرات کے سپرد کردیں۔ اس مقام پر تاریخ کی اصل لفظیں ملاحظہ ہوں:

"استغاثه بخدام والا مقام جناب شہامت انتساب تہور شعار جلالت آثار یکه تاز میدان دلاوری ورزم پرداز معرکه بہادری سید زکریا بن سید خضر بن تاج الدین بن نصیر الدین برو ندو عروس و جمیع ناموس را به پردگیان سرادق سیادت سپردند۔"

فریاد کناں غیر مسلم سہی اپنے پناہ گزیں اور معزز ہندو مہمان کو بچانے میں سید زکریا نے اپنے غلاموں اور خاندان کے نوجوانوں کو حکم دیا کہ وہ غنڈے راجپوتوں کا مقابلہ کریں۔ ایک خونریز جنگ ہوئی اور دشمن پسپا ہوئے۔ اس مقام پر تاریخ کے یہ الفاظ ہیں:

"نسیم فتح وظفر پرچم لوائے سید فرشته سیر بوزید"

بے گناہ عورتوں کی عزت کو بچایا اور انتہائی نیک نیتی سے عورتوں کو ان کے مردوں کے سپرد کیا اور دشمن سے اپنے کردار کی تعریف کرائی۔ اس تہلکہ سے بچنے پر دوسری مصیبت آپڑی اور پرتاب سنگھ کو سیاسی ہوائے مخالف نے پرشد پور کے قلعہ میں قید کردیا، سید زکریا نے اس قید وبند کو سراسر ظلم تصور کرتے ہوئے بادشاہ سے سفارش کی اور زندان بلا سے چھڑایا۔ رائے صاحب

سادات کی رواداری دیکھ کر اسلام کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل سے نکلے۔ یہ پہلی خدمت دین تھی جو تاریخ میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ اجداد کی خدمات کی نقشہ کشی مطولات میں ملاحظہ ہو۔ قدرت نے جس کام کے لئے غفرانمآب کو چنا تھا، وہ ورثہ تھا ان کا اور ان کے سوا کوئی شخص اس طرح خدمت دین انجام نہیں دے سکتا تھا۔

نام اور نسب

اسم گرامی سید علی عرف دلدار علی تھا اور آپ کے والد ماجد سید محمد معین نے اپنے پشت نامے پر نظر رکھتے ہوئے وہ نام رکھا جو اسلاف میں کسی کا نہ تھا۔ آپ تیئیس ۲۳ رواسطوں سے امام علی نقی علیہ السلام کی اولاد تک پہنچتے ہیں، مورث اعلیٰ سید نجم الدین[1] سبزوار سے سالار مسعود غازی کے ساتھ سردار لشکر ہو کر بھارت کی طرف آئے اور اپنی فتوحات سے ظلمت کدۂ ہند میں جابجا توحید کے چراغ روشن کئے۔

قلعہ ودیانگر کو فتح کیا اور نام جائے عیش قرار دیا جو کثرت استعمال سے جائس ہوا۔ پھر اسی نسل کے چشم و چراغ سید زکریا بن خضر نے پٹاک پور پر قبضہ کیا اور اپنے دادا کے نام پر نصیر آباد نام رکھا۔ یہ دونوں دیہات ضلع رائے بریلی میں اس وقت بھی سادات کا مسکن اور بڑا قصبہ، چھوٹا قصبہ سے مشہور ہیں۔

پیدائش اور انقلاب ذہنیت

۱۱۶۶ھ وہ مبارک سال تھا جس میں اس فتحمند خاندان میں دلدار علی کی ولادت ہوئی اور ابتدائی تعلیم اسی معیار پر ختم ہونے والی تھی جو بزرگوں کا چلن تھا۔ ایک روز آپ اپنے کھیت پر

---

[1] نجم الدین سبزواری فاتح ودیانگر بود ۱۴رمراۃ البلاد۔ موصوف کے تین بیٹے تھے۔ ابراہیم دہلی گئے۔ شرف الدین نے وطن میں قیام کیا۔ نصر اللہ بدایوں گئے۔ غفران مآب منجھلے بیٹے شرف الدین کی نسل میں ہیں۔

مویشی لئے ہوئے مصروف کار تھے کہ صدا آئی: ''دلدار علی اپنی تعلیم کو جاری رکھو اور لکھنؤ جاؤ''
اس ندا میں غضب کا اثر تھا اور بجلی کی ایک لہر تھی جو گھرانے بھر میں دوڑ گئی اور زراعت پیشہ ماں باپ نے خوشی سے اکلوتے فرزند کا فراق گوارا کیا اور لکھنؤ بھیجنے پر تیار ہوئے۔

یہ فضل ایزدی تھا کہ والدین اپنے عزیز فرزند کے ہمنوا ہوئے اور اولاد جو ضعیفی کا سہارا ہوا کرتی ہے، نصرت دین میں جدا کرنے میں عذر نہ ہوا۔ بعض تذکروں[۱] میں ہے کہ مولوی باب اللہ اس وقت رائے بریلی میں تھے، بنا بریں صرف ونحو اور منطق کی تحصیل تک آپ وطن سے نزدیک تھے۔ مگر سندیلہ پہنچ کر چشم و چراغ مولوی حمد اللہ یعنی ملا حیدر علی کی مجلس درس میں داخل ہوئے اور فلسفہ وحکمت کا درس شروع ہوا۔ اس وقت آپ بیک بینی دو گوش تھے اور ذوق علم میں وطن سے دور ہونے کا مطلق رنج نہ تھا ممکن ہے یہی وہ سخت وقت تھا کہ آپ نے ایک ہندو بنیئے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ رات بھر اس کی دوکان کی حفاظت کریں اور دوکان کے پڑے پر سونے کی اجازت دے۔

زمانہ طالب علمی کا سارا مطالعہ اور کتب بینی سڑک کی سرکاری روشنی اور بقال کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے ہوئی، الہ آباد میں سید غلام حسین دکنی سے بھی پڑھا۔ فیض آباد جا کر بحر العلوم مولوی عبد العلی سے معقولات میں ایک زبردست مباحثہ کیا اور دوررس فکر و دماغ سے طے کر لیا کہ اب ان کی علمی پیاس کو بجھانے کے لئے جنتا (ہندوستان) کی زمین بے آب ہے۔ شوق کا خلوص اور تکمیل علم کی بیتابی دیکھو عہد آصفی میں نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں صاحب نے سید کی آواز پر لبیک کہا۔ علم پرستی اسے کہتے ہیں، انہیں محسوس ہوا کہ ہندوستان میں اب تک فقہ جعفری کا ماہر ایسا نہیں ہوا جو مجتہد کہا جائے۔ حکومت اودھ کے تعاون سے آپ نے

[۱] تذکرۂ بے بہا، صفحہ ۱۴۶، از مولانا سید محمد حسین نوگانوی

عراق وحجاز کا قصد کیا۔ بیرون ہند کا سفر مہینوں کی صبر آزما مدت کے بعد ختم ہو کر فقہ واصول کی اعلیٰ تعلیم شروع ہوئی اور یہ مبارک سلسلہ مختلف اساتذہ کے درس خارج میں شرکت کرتے ہوئے مدت تک جاری رہا اور نواب اپنی تن آسانیاں چھوڑ کر زحمت انتظار برداشت کرتے رہے حتیٰ کہ مولانا نے مشہد مقدس کے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا اور ایک نہایت وسیع قطعہ ارض کی سیاحت کر ڈالی۔ تعلیم عراق کا وہ واقعہ بھی اہم ترین ابواب زندگانی میں ہے کہ آپ نے اپنی اولاد میں تاظہور قائم آل محمدؐ اجتہاد باقی رہنے کی تحت قبہ دعا کی اور یہ جذبہ تعلیم حضرت ابراہیمؑ خلیل سے حاصل ہوا تھا۔ شرف علم اپنی ذریت میں پہنچانا مطلوب تھا، اوقات استجابت اور اسباب قبولیت جمع تھے، عالم اور مسافر کی دعا، شب قدر کی خاص ساعت، روضۂ شبیرؑ، ناممکن تھا، مراد پوری نہ ہو۔ آپ کے رفیق سفر ایک دیہاتی تھے۔

انہوں نے اپنے مخالف پٹہ داروں کے مرجانے کی دعا کی دونوں حاجتیں پوری ہوئیں۔ اس حقیقت کو علامہ کنتوری[1] مرحوم نے بڑے بسط کے ساتھ بیان کر کے اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ صدہا علماء اور مجتہد روضہ کے مجاورت میں یہ سعادت کیوں نہیں حاصل کر سکے؟ غفران مآبؒ میں کیا امتیاز تھا جو انہیں یہ شرف حاصل ہوا، اوروں کو نہ ہوا۔ یہ خادم دین عرض کرتا ہے کہ غفران مآبؒ قیام کربلا میں اقتران مشتری راس ذنب سے ٹھیک شب قدر میں ہوا جو عموماً چودہ برس کے بعد ہوا کرتا ہے۔ یہ وجہ تھی جو دعا رد نہ ہوئی، اس ساعت کا دعا کی بڑی کتابوں میں ذکر موجود ہے۔

اساتذہ میں حسب ذیل اسماء قابل ذکر ہیں:

(۱) آقا سید علی صاحب ریاض المسائل، المتوفی، ۱۲۲۷ھ

---

[1] ملاحظہ ہو، انتصار الاسلام، جلد سوم، ص ۱۳۶، طبع ۱۹۱۷ء

(۲) آقا سید مہدی موسوی شہرستانی۔

(۳) آقا سید باقر بہبہانی علیہ الرحمہ آپ نے ۱۲۰۶ھ میں اس خاکدان ہستی کو چھوڑا۔

(۴) آقا سید مہدی طباطبائی جو ۱۲۲۷ھ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

(۵) آقا سید مہدی ہدایت اللہ اصفہانی۔

ان حضرات کے دیئے ہوئے اجازات عہد شاہی کے پریس میں طبع ہو کر لکھنو کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اگر اس مقام پر نقل کر سکتا تو برمحل اضافہ اور عربی ادب کا احیاء اور اجازات کا تعارف ہوتا۔

بصرہ سے نجف اشرف تک آپ کا سفر کشتی میں ہوا تھا اور قرنا پہنچ کر ایک طوفان عظیم کا سامنا ہوا، لیکن دریا کی یہ لہریں ان کے توکل کے چٹان سے ٹکریں کھا کر واپس گئیں اور قدرت نے مرکز پر پہنچا دیا۔ عراق سے آپ کیا لائے؟ علم و عمل کی غیر فانی عزت، شرف زیارت جس سے آپ کے اسلاف اپنی ہجرت اولیٰ مدینہ سے اور ہجرت ثانیہ (سبزوار) کے بعد سے مہاجرت کی گونا گوں زحمتوں میں گویا محروم رہے اور ارض شرک پر قیام کر کے کفر و الحاد سے مقابلہ کرتے رہنا ہی ان کے لئے ثواب زیارت تھا۔

علاوہ ان غیر محسوس فضل و شرف کے آپ کے ساتھ جو تبرکات تھے اب وہ ملاحظہ ہوں:

(۱) **تسبیح دُرِ نجف:** کنٹھا تھا ۳۴ دانہ کا، جس کا ہر دانہ بیضہ کنجشک سے بڑا تھا۔

(۲) استاد کا پیرہن جو والد ماجد کے زمانہ تک ایک صندوقچہ میں بند رہتا تھا اور ہم لوگ اس کو آنکھوں سے لگاتے تھے

(۳) صحیفہ کاملہ بخط شہید اول [۱] جس کے خصوصیات پر ایک مستقل عنوان کی ضرورت ہے، اس علمی

[۱] اس صحیفہ کی ورق عکس اور اس کی خصوصیات نظامی جنتری میں دیکھو

یادگار کی دنیا میں نظیر نہیں ہے۔

(۴) سرمہ کا وہ نسخہ جو کسریٰ کے خزانہ سے حضرت سید الشہداء رُوحِی فِدَاہُ تک پہنچا اور علم سینہ [۱] کو سفینہ میں منتقل کرنے والے مستحق تبریک ہیں جنھوں نے باقی رکھا۔ اس سے آپ کی علم الابدان سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ عناصر اربعہ آپ کے لئے سفر عتبات کی یادگار تھی۔ غرض سالہا سال کی جاں فشانی، صحرانوردی اور غریب الوطنی کے بعد واپس آنے کا وقت ہوا، اور لکھنؤ پہنچ کر یقین کرنا پڑا کہ حکومت کی زبان میں وعدہ اور ایفائے وعدہ میں تباین نہیں۔ نواب آصف الدولہ کی خواہش اور حسن رضا کی استدعا پر لکھنؤ میں مستقل قیام ہوا اور حکومت کی طرف سے شہر کے قدیم علاقہ فرنگی محل سے متصل ناف شہر میں جگہ ملی جو اس وقت جوہری محلہ کے نام سے مشہور ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جو پہلا بندوبست ہوا، اس کے قدیم کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خسرہ میں کیننگ اسٹریٹ تک آراضی پر مولوی صاحب لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ امام باڑہ غفرانمآبؒ اسی زمین پر واقع ہے۔

فرنگی محل کو ہمسایہ قرار دینے میں عذر نہ ہونا، آپ کے اتحاد پرور مزاج کا قوی ثبوت اور وہ اعتدال پسندی ومیانہ روی تھی جس میں آخر تک کچھ تغیر نہیں ہوا اور اپنے بلند کردار سے بتایا کہ علماء میں اتحاد واتفاق دونوں کا وجود ہے۔ لکھنؤ پہنچ کر آپ نے صحیح اسلام کی تبلیغ کی اور جہالت و مادیت کے جو قلعہ مستحکم ہو چکے تھے، ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ وہ قبیح رسوم جن کا ہم نے صدر سخن میں تذکرہ کیا، اپنی روحانیت وسچائی سے مٹائے اور اصول دین کی بنیاد قائم کی، فروع مذہب کو پروان چڑھایا۔ اس زمانہ کی ایک مثنوی سے جو لکھنؤ اور دہلی میں بار بار چھپی، یہ اشعار دیکھ کر فیصلہ ہوتا ہے کہ شہر میں بجائے نعرۂ تکبیر یہ رنگ تھا:۔

ہوتی ہے جس جگہ پہ مجلس حال

---

[۱] اس نسخہ کو مع اسناد ناچیز نے اَلْبَلَدُ الطَّیِّب 'دعاؤں کی کتاب' میں درج کیا ہے۔

چھیڑ کر ساز گاتے ہیں قوّال
اک طرف وہ بجاتا ہے ڈھولک
اک طرف ناچتا ہے یہ مردک
کبھی مارے ہے چیخ مثل حمار
کبھی چپ دم بخود ہے ناہنجار
کبھی کہتا ہے قان اور کبھی قین
واہ کیا معرفت ہے اور یقین
بہتوں کو یہ فریب دیتے ہیں
اور زر و سیم ان سے لیتے ہیں[1]

علماء اسلام میں مفتی غلام حضرت جن کے نام پر غربی لکھنؤ میں مفتی گنج محلہ آج تک آباد ہے، شہری عالم اور مفتی سعداللہ، مفتی گھسیٹ خاں، مفتی نعمت خاں اور مفتی جلال جو محکمہ قضا کے صدر الصدور تھے اور دوسرے معاصروں کے ساتھ کوئی بدمزگی نہ تھی۔ خاندان کوکلتاش خاں کے میر منصور اور میر سنگی میں جب درگاہ قدم رسول نو بستہ پر مقدمہ بازی ہوئی اور ۱۰؍ ذیقعدہ ۱۲۱۱ھ کو فیصلہ ہوا تو اس خانہ جنگی کے ثالث آپ تھے۔ اصل دستاویز (جس پر مرقومہ بالا عالموں کی دستخطیں ہیں) کے عیون الفاظ یہ ہیں:

"در کچہری عدالت العالیہ پیش مفتی غلام حضرت برائے سوال و جواب می فرستادیم مدتے آنجا قضیہ ماند عاقبت الامر بحضور جناب سید دلدار علی صاحب مصالحہ شرعیہ واقع شدہ"

[1] مثنوی تحفہ جعفری، ص ۷۹، طبع دہلی

یہ دستاویز عہد آصف الدولہ کے سنی شیعہ اتحاد پر گواہ ہے اور کاغذات موجودہ متولیان کے پاس اسی فیصلہ کی بنا پر اب تک موجود ہیں، آپ کی ساری کامیابی اور مذہب حق کی ترویج کا راز مرنجان مرنج رویہ تھا جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور یہ خدمت خلق ان کو تورث سے حاصل ہوئی تھی۔ ابتدائے کلام میں ان کے اجداد کے خدمات گزرے۔

لکھنؤ میں فقہ جعفری کو فروغ اور ہندوستان میں پہلی نماز جماعت

غلام علی بن محمد اکمل خاں، نواب حسن رضا خاں مرحوم اور غفران مآبؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"بانی جمعہ و جماعت در اثنا عشریان در لکھنؤ او بوده است۔ در ہیچ شہرے از شہر ہائے ہندوستان نماز جمعہ و جماعت در مذہب امامیہ رائج نبود بلکہ کسی را گمان این ہم نبود کہ در ایران و بلاد عرب نماز جماعت در اثناء عشریان گزارده می شود"[۱]

"لکھنؤ کے مذہب اثناء عشری میں جمعہ اور جماعت کے بانی علامہ دلدار علی تھے (قدیم) ہندوستان کے کسی شہر میں مذہب امامیہ کی جماعت اور جمعہ نہ ہوا تھا بلکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے یہاں عرب وعجم میں بھی جماعت نہیں ہوئی"

نجم الغنی دوسرے مورخ نے بھی اس اولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے جماعت میں مرزا جوان[۲] بخت شاہزادہ دہلی کی شرکت کا مزید اظہار کیا ہے۔ بقول عبدالحلیم شرر[۳] "آپ ہی لکھنؤ کے پہلے مجتہد ہیں"۔ اس ولولہ انگیز موعظہ اور عالمانہ تقریر پر آصف الدولہ کا حلقہ بگوش ہونا اور ان

---

۱ تاریخ عماد السعادت ص ۱۳۷، طبع نول کشور ۱۸۶۴ء

۲ تاریخ اودھ جلد: ۳، ص: ۱۳۲

۳ گذشتہ لکھنؤ ص ۱۰۲

کی توبہ کی حکایت تاریخوں میں دیکھو۔[1] شاہ حسین مرزا صفوی طوسی اپنے طویل منظومہ میں آپ کو قدیم ہندوستان کا پہلا امام جمعہ و جماعت قرار دیتے ہیں: ؎

میر دلدار علی صفوہ اطیاب کرام
رکن ایماں بخدا بود عماد اسلام
عالم باعمل و مجتہد قدس نژاد
ہادی مذہب حق نائب معصوم و امام
ہازم زمرہ اتباع صنم ہائے قریش
چو پیمبر بصوارم چوغضنفر بحسام
برق وش مجمع ارباب تصوف رازد
بشہابے کہ بود ثاقب وناقد چوسہام
کردتاسیس اساسی کہ بہ تحقیق اصول
بہر اصحاب خطا نیست دراں جائے کلام
مجتہد پیش از او کس نشدہ بود بہ ہند
جمعہ و وعظ و جماعات بہ او یافت قوام
لکھنؤ مثل صفاہان ز فیوضش گردید
نہج اثنا عشری یافت زاورونق تام[1](۱)

زمانہ حال کے غیر شیعہ مفکر اور ارباب ادب میں گھانسی رام، ایم۔اے۔، ایل. ایل. بی. اور مولوی محمد ناظم بی. ایس. سی. ہر دو مولف عہد آصفی کو (عہد) حاتم ثانی تصور کرتے ہیں اور

---

[1] انتصار الاسلام جلد ۳ و تاریخ العلماء وغیرہ

رقمطراز ہیں: نواب تعصب مذہبی سے پاک تھا اور دربار میں ہر مذہب وملت کے لوگ ایک نظر سے دیکھے جاتے تھے، علم کی قدردانی ایسی تھی کہ غفران مآبؒ مولوی[1] دلدار علی کو انہوں نے مالا مال کر دیا، مولوی فضل حق خاں صفی پوری کو عہدہ آب کاری عنایت کیا۔

یہ اشارہ ان مواضعات کی طرف ہے جو ضلع رائے بریلی اور اناؤ میں بسلسلہ معافی تھے اور وہ پنشن بھی اس اجمال کی تفصیل ہے جو اولاد غفران مآبؒ میں بعض افراد تک تقسیم ہوتے ہوتے حصّہ رسد پہنچی ہے۔ مولوی منشی افضل حسین ثابت لکھنوی حیات دبیرؔ میں مرزا صاحب کے اجداد کی علم دوستی اور ان کے دینی گرد وپیش کی تصویر کشی میں لکھتے ہیں:

پہلا خط غفران مآب حجۃ الاسلام مولانا السید دلدار علی صاحب قبلہ آعلیٰ اللہُ مَقَامَہُ فِی الْجِنَانِ کا مورخہ ۱۲۱۶ھ ہے، جس کو میں لفظ بہ لفظ مع ترجمہ تبرکاً لکھتا ہوں کہ ہندوستان میں یہ سب سے پہلے مجتہد ہوئے ہیں ان کی وجہ سے ہندوستان کے تمام شیعوں میں دینداری پھیلی ہے، اکثر اہل علم شیعوں کے خاندان انہیں کے خانوادہ کے تعلیم یافتہ اور شاگرد ہیں۔ ان کی تحریر کو شیعہ آنکھوں پر رکھتے ہیں۔

جناب مرزا صاحب کرم فرمائے دوستاں مستجمع الطاف واحسان عالی مراتب والامناقب مرزا غلام حسین صاحب دَامَ مجدُهُ۔

بعد سلام مسنون الاسلام واضح رائے شریف باد کہ مبلغ پانصد روپیہ منجملہ زکوٰۃ و خمس کہ بدست مسمّی غلام حیدر فرستادند، رسید۔ انشا اللہ تعالی بمستحقین مومنین تقسیم کردہ خواہد شد زیادہ والسلام مرقومہ چہارم شہر رمضان ۱۲۱۶ھ (۲)سید دلدار علی

[1] روح ادب، حصہ سوم ص: ۲۰۱

•سا۱۲۱ھ حیات دبیرؔ، ص: ۹۔

مرزا صاحب کے بزرگوں کے لکھنؤ آنے پر اپنے تعارف میں وطن کی نجابت اور عالی نسبی پر ایک استشہاد تیار کرنا پڑا جس پر غفران مآب کی دستخط ہے۔ منشی صاحب موصوف کتاب مذکور میں لکھتے ہیں:

''اس پر شہنشاہ عالم دہلی کی مہر ثبت ہے اور عبارت میں لکھا ہے کہ ان کے بزرگ شرفاء شیراز سے تھے اور مابدولت کی سرکار میں عہدۂ جلیلہ پر سرفراز و ممتاز تھے۔ اس کے بعد حجۃ الاسلام مولانا سید دلدار علی مجتہد اول لکھنؤ اور مرزا کاظم علی صاحب محدث اور حسن رضا خاں نائب صوبہ اودھ، ص:٦ پر ذکر ہے''

تبلیغی جدّ و جہد

آپ کو لکھنؤ پہنچنے پر قوم کی اندرونی اصلاح اور ان میں ذوق علم پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دو زبردست طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ صوفیت اور اخباریت کی گھٹائیں تھیں جو فریقین پر چھائی ہوئی تھیں، اور مسلمان پسے جا رہے تھے۔ یہ وہ تصوف نہ تھا جس کا پس منظر محبت اہل بیتؑ ہو بلکہ انسان کو وہ ڈرونا لباس پہنایا تھا اور وہ گھنونے رویّے اختیار کئے تھے جس کو دین سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گردش قلم اور زور تقریر نے معلوم نہیں کتنے معرکے سر کئے۔ ابھی یہ جراثیم کلیۃً فنا نہ ہوئے تھے، کہ نواصب نے دہلی سے سر اٹھایا اور تحفۂ اثنا عشریہ وجود میں آئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ آپ کا حلقۂ تلامذہ وسیع ہو چکا تھا اور مبدء فیاض نے علم کی بہتات کے ساتھ کثرت نسل کا شرف بھی عطا کیا۔ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے کو پانچ فرزند برابر کے عطا ہوئے اور تحفۂ مسروقہ کے ابواب کی تقسیم شاگردوں اور اولاد میں ہوئی۔ متعدد جواب تیار ہو گئے اور عصبیت کے اس چراغ کو گل ہوتے ہی آپ نے اپنی حیات ہی میں دیکھ لیا۔ عزاداری کی خدمت میں

جو قلم فرسائی کی اور اپنے مواعظ میں زبان سے جو نصرت کی اس کے علاوہ امام باڑہ تعمیر کیا، جو بحمدہ اپنی روائتی شان وشوکت کے ساتھ آج بھی شہرۂ آفاق ہے۔ سب سے پہلے ذاکری کو فروغ دیا اور فاضل جلیل میرا کبر علی کو موقع دیا کہ وہ روضہ خوانی کریں۔

''ضِيَاءُ الْأَبْصَارِ'' آپ کے عہد کی وہ پہلی اردو کتاب ہے جس میں واقعہ کربلا کی معتبر روایات ملتی ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی ہے اور فاضل مصنف نے دیباچہ کلام میں مبارک تحریر کا تذکرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ۲۱/ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ کو مرزا اکبر علی نامی ایک شخص جناب کی خدمت میں حاضر تھے اور اپنے ہم نام ورفیق سید اکبر علی ابن سید فضل علی رضوی کی طرف اشارہ کیا کہ یہ حدیث پڑھتے ہیں۔

جناب نے فرمایا: ہمارے یہاں پڑھوایئے۔ آپ نے کتابیں نہ ہونے کا عذر کیا۔ جناب نے اپنے کتب خانہ سے کتابوں کی مدد دی اور ''ضِيَاءُ الْأَبْصَارِ'' اردو میں چودہ تذکروں پر مرتب ہو کر تیار ہوئی۔ دیباچہ کتاب کی ابتدا اس طرح ہے:

''نَحْمَدُكَ يَامَنْ جَعَلَ الدُّنْيَا الْفَانِيَةَ لِأَوْلِيَائِهِ دَارَ سِجْنٍ وَمِحْنَةٍ وَبَلَاءٍ''(۳)

میرے کتب خانہ لکھنؤ میں خطی نسخہ کامل موجود ہے۔ مولانا سید محمد سجاد عرف لڈن صاحب مناظر مرحوم ان کے احفاد میں مشہور ہستی گزرے ہیں۔ ان کے تلامذہ[۱] لکھنؤ اور پاک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مناظرے

آپ نے آصف الدولہ مرحوم کا آخری دور حیات اور نواب سعادت علی خاں مغفور کی پوری

[۱] ترجمہ اردو نہج البلاغہ، ج:۳،ص:۲۶۳۔

زندگی دیکھی۔ سیاسی انقلابات افراد کے عروج وزوال کے نقشے ملاحظہ کئے۔ نواب مجسمہ عقیدت سہی پھر بھی اپنے وقت کے فرمانروا ہیں، ان کی صحبت میں ہمہ وقت لطف ومحبت کہاں؟ کبھی مزاج سلطنت برہم، کبھی اہل دربار چیں بجبیں۔ اس پُرخطر ماحول سے دوچار ہونا زندگی کے کرشمہ تھے جن کا آئے دن سامنا رہا کرتا تھا اور حضرت اَمِیْرُالْمُؤمِنین صَلَوَاتُ اللہِ وَ سَلَامُہٗ عَلَیْہِ کا فرمانا: ''بادشاہ' کا ندیم ایسا ہے جیسے شیر سوار دیکھنے والے (اس کے مقرب ہونے پر) رشک کرتے ہیں، لیکن وہ اپنی جگہ کی نزاکت سے اچھی طرح واقف ہے۔'' اس ماحول میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بزم حکومت کی نشست میں کسی مسئلہ کا جواب ڈر کر دیا ہو یا کسی حاشیہ نشین اقتدار سے مرعوب ہوئے ہوں۔ مناظروں کی نوبت آئی۔ نواب کے استاد سے بار بار مکالمہ ہوئے۔ خدا نے وہ ہردلعزیزی پیدا کی کہ بزم سلطانی کے لوگ بھی کمالات کا دم بھرتے تھے۔ ذیل میں ایک مسئلہ پر گفتگو بہت ہی قدیم حوالہ سے درج کی جاتی ہے۔ کتاب کا یہی حصّہ بدنصیبی سے بوسیدہ اور شکستہ تھا سوء اتفاق دیکھو کہ ہندو پاک کے کسی کتب خانہ میں مجھے یہ کتاب آج تک دستیاب نہ ہوئی، ورنہ سطروں کے تلف شدہ الفاظ کی جگہ آپ پوری عبارت دیکھتے پھر بھی تقریب مطلب کے لئے پیش شدہ جزو عبارت کافی اور چھوٹے ہوئے الفاظ کو پُر کرنا ایک معمہ سے زیادہ مشکل تو نہیں ہے۔ میرے تحفظ آثار قدیمہ کے جذبہ اور حزم واحتیاط کا آپ فیصلہ کریں۔

ورق شکستہ کی بعینہٖ نقل

۔۔۔۔مظہر العجائب میں ہے ایک دن مولوی سدن اور مرزا قتیل اور ۔۔۔۔ نواب سعادت علی خاں نے میر دلدار علی صاحب سے مجتہد۔۔۔۔۔ کمالیت وصحت میں تردد ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا اس کے بہت ۔۔۔۔۔ انسان میں چشم گوش ۔۔۔۔۔ اُن میں

عمدہ۔۔۔۔۔موجود ہیں الفاظ اور روایات وغیرہما کی تکرار بے شمار ہے۔۔۔۔۔مختتم الاسقاط ہوئیں۔۔۔۔قرآن اشرف الکلام ہے، ۔۔۔۔۔فرمایا اگر قرآن اشرف الکلام ہے انسان اشرف المخلوقات ہے۔۔۔۔۔۔وسیلہ جلیلہ،ص:۴۶، چھاپہ۔۔۔۔۔

یہ ۱۳۵۴ھ ہجری کے میرے مطالعہ کا ایک افادہ تھا جو اگر نقل نویسی میں کامل ہوتا تو اس زمانہ کے ادبا میں خدا جانے اور کس کس کا نام معلوم ہوتا۔مرزا محمد حسن قتیل جن کی وفات غفران مآب کی وفات سے ۳ برس پہلے ۱۲۳۳ھ میں ہوئی اور رقعات مرزا قتیل فارسی ادب میں ان کی یادگار موجود ہے اور مولوی سدن المتوفی ۱۲۲۹ھ اتالیق واستاد نواب تھے۔جن کے بھائی کا نام مولوی مدن تھا۔تاریخ اودھ اور اردو ادب میں یہ نام محتاج تعارف نہیں ہے۔موخرالذکر کا اصل نام مولوی مجید الدین تھا اور دونوں بھائی محلہ شرقی شاہجہان پور کے رہنے والے تھے امیر مینائی کا مشہور شعر انہیں پر ہے،

بڑھائی شیخ نے ڈاڑھی (اگرچہ) سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

حاصل شدہ ورق کے رہے سہے الفاظ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف میں بعض آیات کی تکرار کیوں ہے؟ اس کو کتاب خدا سے خارج کیوں نہ کردیا جائے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کے جواب میں آپ نے فرمایا: پیکر بشری میں آنکھوں اور کانوں اور ہاتھ پیر کا مکرر ہونا، پھیپھڑے اور گردوں کا مکرر ہونا، انگلیوں کا دس عدد ہونا، بالوں کا بے شمار ہونا اگر حسن ہے تو سورہ رحمن کلام الٰہی میں ''فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ'' (پس تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) کا بار بار آنا اور مرسلات پ:۱۹، میں ''وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ'' (اس دن جھٹلانے والوں کے لئے ویل ہے) کا کئی کئی دفعہ ہونا ''إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ'' (میں

تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں) کی سورہ شعراء میں تکرار صحیح اور برمحل ہے۔ یہ جواب اس مجمع کے روبرو ہے جو استعداد علمی سے دور تھا، اور مشاہدات اس کے لئے تشفی بخش تھے۔

اطلاع:

مطبع مظہر العلوم پیر بخار الکھنؤ کی فہرست کتب پڑھنے سے معلوم ہوا کہ کسی علم نواز شاعر نے مثنوی باغ ایمان و چراغ ایمان غفران مآب کے ایک عیسائی سے مناظرہ کو سوال و جواب کی شکل میں ترتیب دیا، اور چھپوایا، میری نظر سے کبھی یہ نوادر نہیں گزرے۔ لکھنؤ میں یہ دفینہ آپ کو ملے گا۔

سلطنت اودھ میں غفران مآب کی حیثیت

شمس العلماء محمد حسین آزاد المتوفی ۱۹۱۰ء شعراء لکھنؤ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں، میر علی صاحب لکھنؤ کے مشہور مرثیہ خواں پر عتاب شاہی ہوا اور میر صاحب نے لکھنؤ چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ انشا کو خبر ہوئی۔ اسی وقت سعادت علی خاں کے پاس پہنچے۔

نواب نے متحیر ہو کر پوچھا: خیر باشد پھر کیوں آئے؟

انہوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا

یارب بنا بنی میں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا حضور غلام جو اس وقت رخصت ہو کر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولہا دولہن کی عروس سلطنت کو دیکھوں حضور واقعی کہ بارہ ابھرن سولہ سنگار سے سجی تھی۔ سر پر جھومر، وہ کون مولوی دلدار علی صاحب۔ کانوں میں جھمکے وہ کون دونوں صاحبزادے۔ گلے میں نولکھا ہار، وہ کون

خان علامہ غرض اسی طرح چند زیوروں کا نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں۔ دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے۔ یہ کیا؟

نواب نے پوچھا پھر وہ کون؟ کہا: حضور نتھ،

میر علی صاحب بعد اس کے کیفیت مفصل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا کہ ان کی دوراندیشیاں بیجا ہیں، ایسے صاحب کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں، غرض اس شہرت بے اصل کے دفعیہ کے لئے ترقی کا پروانہ، اور پانچ سو روپے کا خلعت لے کر وہاں سے پھرے۔ (آب حیات)

اس بیان میں دونوں صاحبزادوں سے مراد غفرانمآب کے پانچ بیٹوں میں سلطان العلماء اور سید العلماء مراد ہیں، جو اپنے علمی کمالات میں والد علاّم کے سامنے مرجع خلق ہو چکے تھے۔ آزاد خیال شعراء اور اکابر ادب بھی غفران مآب کو قوم کا راس و رئیس سمجھتے تھے۔

(جناب غفران کی صد سالہ یادگار پر علامہ کنتوری کا ایک حقیقت افروز اعلان)

۱۳۳۵ھ میں تمام ہندوستان نے غفران مآب کے روز وفات پر مجلسیں کیں اور ملک کے چپہ چپہ سے اظہار عقیدت ہوا۔ اس وقت علامہ سید غلام حسنین کنتوری نے 'اخبار اثناء عشری' دہلی کے صفحات میں اپنے تاثرات سے اس تحریک کو کامیاب بنایا۔ ممدوح کے یہ مقالات کتابی صورت میں آج موجود ہیں اور علامہ اپنے ولولہ انگیز نوٹ میں رقم طراز ہیں:

غفران مآبؒ نے دین کا چراغ تمام انڈیا کے گھر گھر میں روشن کر دیا اور ایسی روشنی جس کو آج ایک مہینہ کم سو برس گزرے روز وفات سے مرحوم غفران مآب کی، مگر آج بھی ہمارے ملک میں ایک ہزار سے زیادہ علمائے دین موجود ہیں:

''كَثَّرَ اللّٰهُ اَمْثَالَهُمْ''

''اللہ ان جیسوں کو زیادہ کرے''

یہ انہیں کی ذات کا فیض ہے۔[1]

باقیات الصالحات

غفران مآبؒ کے آثار باقیہ میں تالیفات، اولاد اور تلامذہ کے علاوہ حسب ذیل باقیات الصالحات بھی ہیں:

۱۔ سرزمین لکھنؤ پر سب سے پہلے آپ نے کتب خانہ قائم کیا جس کے بعد دیگر اہل علم میں لائبریریاں قائم ہوتی رہیں اور اسی اولیت کی برکات ہیں کہ اس وقت مرکز پر ایک لاکھ کتابوں سے کسی طرح کم نہ ہوں گی اور لکھنؤ کے علمی ذخیرے نظر امتیاز سے دیکھے جاتے ہیں۔ زمانہ کی سرد و گرم ہواؤں سے اصل کتب خانہ غفران مآب تو باقی نہیں، مگر ان کی خصوصیات اور عظمت رفتہ کے نقوش کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ ۵/ربیع الاول ۱۳۶۳ھ کو ریاست رام پور کے عزاخانہ میں جو تبرکات ہیں، اس میں ایک پارہ قرآن بخط کوفی دیکھا جو امام رضا علیہ السلام کے خط مبارک کی طرف منسوب ہے اور اس پر عبارت ہے، از مملوکاتِ والدی ماجدی جناب سید دلدار علی صاحب اسٹیٹ میں یہ پارہ کہاں سے آیا، کس کے دور اقتدار میں پہنچا، مجھے خبر نہیں، عبارت مذکور کے نیچے غفران مآب کے تیسرے صاحبزادے سید المفسرین مولانا سید علی صاحب قبلہ کی مہر سیاہی خام ہے یہ ہمارے لخت دل تھے جو آخری متولیان کی غفلت سے ادھر منتقل ہوئے یَالِلْعِلْمِ وَضِیْعَتِه۔

(۲) امام باڑہ جس سے قوم میں مجلسوں کی بنیاد قائم ہوئی اور اسی ارض پاک پر غفران مآب کی آخری آرام گاہ اور مزار بھی ہے۔ غربی صحنچی وہ مقدس مقام ہے جہاں السپ کمیٹی کے فیصلہ پر حکومت کی نظر ثانی ہونے کے سلسلہ میں جب جناب نجم الملۃ مولانا سید نجم الحسن صاحب

[1] اِنتصارُ الِاُسلام جلد سوم، ص:۲۱/از علامہ کنتوری المتوفی ۱۳۳۷ء

قبلہ مرحوم المتوفی ۱۳۶۰ھ کا عدالت عالیہ میں اظہار ہو رہا تھا تو، سرکار ناصر الملۃ مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ المتوفی ۱۳۶۱ھ قبر غفرانمآب ؒ حضیرہ کے پاس مصروف دعا تھے، اس عزاخانہ پر صفیؔ مرحوم، ناصرؔی المتوفی ۱۳۴۹ھ، عزیزؔ المتوفی ۱۹۳۵ء کی نظمیں طول کلام کے خوف میں ترک کی جاتی ہیں۔ شیعی دنیا میں شام غریباں کی مجلس اسی عزاخانہ کی یادگار ہے جس سے قوم کا بچہ بچہ واقف ہے۔

(۳) دوسرا امام باڑہ جو نصیرآباد میں ہے اور وطنی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

(۴) مسجد نصیرآباد اس خانہ خدا کا قطعہ تاریخ دیوان ناسخ سے نقل کیا جاتا ہے۔

ولد زہرا و دلدار علی
کامل اندر اجتہاد و اتقا
ساخت چوں مسجد شدہ تاریخ آن
مسجد اقصائے ثانی شد بنا (۴)

۱۳۲۷ھ

(۵) عرب میں نہر آصفی اور بھارت کے مواضعات رائے بریلی و اناؤ میں جابجا وہ کنوئیں قابل ذکر ہیں جو واٹرورکس کی بنیاد قائم ہونے سے پہلے خلق خدا کے سیراب ہونے کے لئے آپ کی یادگار ہیں۔ ان مواضعات[۱] کی آمدنی ۱۳۳۶ھ تک چھ سو روپے ماہوار تھی۔۔ نہر آصفی پر تاریخ شیعہ حصّہ دویم میں بحث ہو چکی ہے۔

(۶) روضۂ حضرت[۲] سید الشہداء رُوحِی فِدَاہُ کی تعمیر میں حصّہ اور نواب اودھ کے زر و مال کی

ترسیل، یہ وہ پہلا قدم تھا جس کو ان کی اولاد نے اور بڑے پیمانہ پر پہنچایا۔

تلامذہ

شاگردوں کی فہرست دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنہوں نے غفران مآب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، وہ ایک دوسرے سے جداگانہ علوم وفنون میں ممتاز تھے اور چونکہ غفرانمآبؒ ملک میں معمار اول تھے، اس لئے ان کے میکدۂ علم کے جرعہ نوش کسی دوسرے در سے تو آشنا نہ ہوئے، ہر شخص صرف ان کا شاگرد تھا اور وہ علوم کے بحر بیکراں تھے، جنہوں نے طلبہ کی صلاحیتیں دیکھ کر جس کو جس فن سے مناسبت دیکھی اس کو اس فن کا مجتہد بنایا اور یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر شاگرد نے غفران مآب کی انگلی پکڑ کر ادب کی راہ پر چلنا سیکھا۔

(۱) **مولانا مفتی سید محمد قلی صاحب قبلہ نیشاپوری:** کنتوری جن کو کلام ومناظرہ سے بے پناہ شوق تھا، تَشْئِیْدُ الْمَطَاعِنِ اور تَقْلِیْبُ الْمَکَائِدِ وغیرہ وہ معرکہ آرا تصنیفات ہیں جو محتاج تعارف نہیں۔ آپ تلامذہ میں خصوصی عظمت کے حامل تھے، میرٹھ میں مفتی قرار پائے[۱] اور اسی اختصاص کا ثمر تھا کہ آپ کی آخری آرام گاہ بھی استاد کا وہ مشہور عزاخانہ ہے، جہاں سپرد خاک ہونے کی تمنا ہر دل میں تھی آپ کے علمی کمالات توارث میں ابھی تک باقی ہیں۔

قطعہ تاریخ از مفتی میر عباسؒ

چوں فاضل مفتی پسندیدہ خصال
بگذشت ز عالم بہ یزداں پیوست

[۱] ضربت حیدریہ، ص: ۳۳۸

برمرقد او نوشتہ شد تاریخش
ایں قبر مقدس محمد قلی است[1] (۱۲۶۰ھ)(۵)

(۲) **علامہ سید احمد علی محمد آبادی:** فقہ واصول اور معقول ومنقول میں بلند درجہ پر فائز تھے۔ان کے تلامذہ کا سلسلہ بھی منقطع نہیں ہوا۔بڑے بڑے افاضل مجلس درس سے منتخب روزگار ہوکر نکلے۔ادبی کمالات میں خود ان کے چشم و چراغ اور خلف الصدق مولوی علی میاں کامل مرحوم و مغفور اور ان کے شاگرد حضرت صفی لکھنوی جنہوں نے ایک طویل عمر کے بعد اس دنیا کو چھوڑا،افق ادب کے وہ تابندہ ستارے ہیں جن سے دنیائے شعر وسخن کسب ضیا کر رہی ہے۔محمد آباد گہنہ اب تک علم وفضل اور مشرقی کمالات کا گہوارہ ہے۔

(۳) **جلالت مآب سبحان علی خاں:** علم کلام ومناظرہ میں یدطولیٰ ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے سیاست داں تھے۔حسن تدبیر اور عقل ودانش سے عہدہ نیابت وزارت تک پہنچے۔خدمت خلق کا جذبہ رگ وپے میں تھا۔ان کے دور نیابت میں روپیہ کا بیس سیر گیہوں[2] بازار میں بکتا تھا۔آپ کے خاندان میں کمبوہ افراد الہ آباد میں مقیم تھے۔آپ کے تصنیفات میں ایک دیوان اور ذخیرہ علمی یادگار ہے۔الہ آباد اور گردونواح میں آپ ہی کی ذات سے دینی خدمات کی بنیاد قائم ہوئی۔موصوف کے بعض تالیفات کے خطبے حضرت سلطان العلماء کے انشاء کردہ ہیں۔یہ تعاون تبرکاً ہوا کرتا تھا۔

(۴) **مرزا محمد خلیل:** ارشد تلامذہ میں تھے۔زہد وورع نے اس قدر بلند کیا کہ درجہ خردی سے خلت پر فائز ہوئے۔آپ کے تصانیف میں سے کوئی بھی دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہی۔[3] تذکرۃ

العلماء میں حالات زندگی دیکھو۔

(۵) **سید محمد باقر واعظ:** ایک وسیع النظر اور قادر الکلام خطیب تھے، جن کو اہل علم مجلسی دوراں، کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

(٦) **مرزا محمد رفیع عرف مرزا مغل غافلؔ:** آپ کو فن طب میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ استاد کی طرف سے تراجم کی خدمت تفویض ہوئی تھی، چنانچہ "بحار الانوار" کی دسویں جلد کا فارسی ترجمہ آپ کی یادگار ہے۔ اس شہکار کا نسخۂ خطی ٦ / جمادی الآخر ۱۲۴۹ھ کا لکھا ہوا بخط علی رضا ابن آغا صادق کاتب بہترین شکل وشمائل میں کتب خانہ ممتاز العلماء واقع عقب مسجد تحسین چوک لکھنؤ میں موجود ہے۔

(۷) **مرزا فخر الدین احمد خاں معروف بمرزا جعفر:** آپ کو علم نجوم میں کمال حاصل تھا اور اس فن میں بھی وہ استاد کے کنز مخفی کی یادگار تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ علم عہد غفرانمآبؒ سے پہلے ہندوستان میں آچکا تھا۔ غفران مآب نے اپنے تلامذہ کو حدود باطل پہنچوائے اور وقت ضرورت استعمال کی اجازت دی۔ لکھنو میں جتنے صاحبان کمال گزرے اور اس فن میں جتنے تراجم اور تالیفات مدوّن ہوئے وہ اسی نقش اول کے رہین منت تھے۔ لکھنؤ میں اس فن کے آخری ماہر اور یادگار تالیف "اَلْوَاحُ الْجَوَاھِرِ" افلاطون کا اردو ترجمہ ہے جو مولوی ابوالحسن بن میر مہدی کا رشحۂ کلک ہے۔ اور ۱۳۰۵ ہجری میں مطبع اعجاز محمدی لکھنؤ سے نشر ہوا۔ یہ باکمال مولانا سید ابوالحسن صاحب مرحوم مصنف "حجج قاطعہ" کے علاوہ ایک گوشہ نشیں بزرگ تھے جن کی زندگانی صرف اسی فن میں ختم ہوئی۔ مرزا صاحب نے استاد کے سامنے رحلت کی۔ تذکرہ بے بہا، ص ۲۸۱ میں ان کا مفصل حال ہے۔

(۸) **مولوی سید یاد علی نقوی نصیر آبادی:** آپ نے فارسی زبان میں تفسیر قرآن لکھی جو بھارت میں

فرقہ امامیہ کی پہلی فارسی تفسیر ہے۔

(۹) **سید مرتضیٰ:** آپ کی تالیف ''اَسْرَارُ الصَّلوٰۃِ''، تحقیق، تدقیق اور استعداد فقہ پر گواہ ہے۔ سفر حج میں بمقام فخ انتقال کیا۔ شفیق استاد نے یہ صدمہ بھی برداشت کیا۔ تذکرہ بے بہا صفحہ ۳۲۰ر میں ان کا حال ملاحظہ ہو۔

(۱۰) **حکیم مرزا علی شریف:** آپ ایک طبیب حاذق ہونے کے ساتھ جامع معقول ومنقول تھے۔ علم کلام وفن طب کی کتابوں پر آپ کے حواشی باقیات الصالحات سے ہیں۔ لکھنؤ کے اکثر ''اَطِبَّاء'' کا سلسلہ آپ کی طرف پہنچتا ہے۔ غفران مآبؒ کے طبی ذوق سے افاضل طُلاَّب نے جو ثمرات ونتائج مرتّب کئے وہ خدمت خلق کا ایک ناقابل انقطاع سلسلہ ہے۔

(۱۱) **مولانا سید حمایت حسین عرف میر علی بخش کنتوری:** بلند مرتبہ انسان تھے۔ استاد کی تالیف ''اَسَاسُ الْاُصُولِ'' کا اردو ترجمہ ان کی اصولی قابلیت پر گواہ ہے۔ اس فن میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے غیر مانوس مسائل کو اردو کا جامہ پہنایا، اور اپنے افراد خاندان کو دعوت علم وعمل دی اور وہ وقت آیا، کہ کنتور اور جرول کے علمی ادبی تالیفات مطبع عین الفیوض کے نشریات ایک مستقل باب ہے جس کی تشریح میں طول کلام زنجیر پا ہے۔

(۱۲) **مولانا مرزا اسمٰعیل:** آپ تکمیل کے بعد عتبات عالیات کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حیدر آباد دکن میں قیام کر کے تبلیغی خدمات انجام دیتے رہے۔

(۱۳) **مولانا مرزا محمد علی صاحب مرحوم:** آپ بھی تحصیل کے بعد عراق وحجاز کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے اور حج سے مشرف ہو کر آخر تک مکہ معظّمہ میں ٹھہرے رہے اور دین حق کی تبلیغ میں عمر بسر کی۔

یہ دونوں بزرگ وہ تھے جنھوں نے استاد کے دینی خدمات کے اظہار میں وہاں کے اہل علم اور بادیہ نشین اعراب کو مطّلع کیا اور نجدیت کی بادسموم میں اپنے تیئں زندہ رکھا۔

(۱۴) **مولوی سید سجّاد علی صاحب جائسی:** آپ نے عِمَادُ الِاسلَام کے مقدمات کا اردو میں ترجمہ کیا۔

(۱۵) **مرزا زین الدین احمد خاں عرف مرزا محسن:** آپ ادب اور فن عروض وقوافی میں یکتا تھے۔

(۱۶) **مولوی منو خاں صاحب:** تبدیلیٔ مذہب نے آپ میں جو ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا، اس کی معاصرین میں نظیر نہ تھی۔

(۱۷) **مولانا سید عبد العلی صاحب دیوکھٹوی:** آپ فیض آباد کے خاندان پیش نماز کے مورث اعلیٰ تھے۔

(۱۸) **مولوی سید محمد صاحب:**

(۱۹) **مولوی سید کلب علی صاحب:**

پسران مولانا عبد العلی صاحب مرحوم۔ ہر سہ بزرگواران نے فیض آباد اور گرد و نواح کے چپہ چپہ میں اپنی آواز پہنچائی اور ترویج مذہب حقّہ سے ضلع بھر کو معمور کیا۔ تذکرہ بے بہا، ص ۲۱۳ میں سیرت موجود ہے۔

(۲۰) **مولانا مرزا کاظم علی صاحب محقّق:** آپ غفرانمآب کے ابتداء زندگی کے طلاب میں تھے، اور آپ کو مولانا الحاج سید احمد علی صاحب کے استاد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ آپ کے حالاتِ علم و کمال سفر السعادہ میں موجود ہیں۔ آپ کی نظر مبارک سے گذرے ہوئے شیعہ کتب دینیات کی قدر و قیمت کا مرزا قتیلؔ[۱] نے شاندار طریقے پر ذکر کیا ہے۔ تذکرہ بے بہا،

[۱] رقعات مرزا قتیلؔ، رقعہ نمبر ۱۲۵ ص ۸۴، طبع نظامی، کانپور ۱۲۹۰ھ

ص ۳۹۵ر میں حالات زندگی آپ دیکھ سکتے ہیں۔

منشی افضل حسین صاحب ثابتؔ ان کے حال میں لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب ایک مشہور عالم اخباری شیعہ تھے، مرزا دبیرؔ نے ان سے بھی پڑھا تھا فتح الدولہ مرزا محمد رضا برقؔ مصاحب خاص شاہ اودھ انہیں کے فرزند ارجمند تھے جو ناسخؔ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''ان کے علم و فضل کی تمام لکھنؤ میں دھاک تھی اور زہد وورع کا شہرہ تھا، انہیں کے اخلاق حمیدہ کی نسبت مرزا جعفر علی (فصیحؔ) مرحوم مثنوی نان ونمک میں فرماتے ہیں:ـ

عالم عامل فقیہ لوذعی

ہادی کامل امام یلمعی

ابر رحمت آفتاب مکرمت

کو کب دری سحاب مکر مت

مالک اقلیم زہد و اتقا

حکمران کشور حلم و حیا

حامی دیں ماحی کفر و ضلال

سرگروہ عالمان با کمال

گلشنِ شاداب گلزاز علی

طالب حق میرزا کاظم علی(۲)

فن طب میں وہ طبیب حاذق اور جسمانی ریاضت میں بھی وہ قوی ہیکل جوان اور سپہ گری

کےفن سے واقف تھے۔ یہ نکتہ شیخ امام بخش ناسخ کے قطعہ تاریخ سے واضح ہوتا ہے، تذکرہ بے بہا،ص۲۹٦، فاضل نوگانوی نے بھی ان کا حال نذر قرطاس کیا ہے۔ اگر طول کلام کا محل ہوتا تو، میں حالات میں مزید صفحات سیاہ کرتا۔ ناسخ کا قطعہ تاریخ یہ ہے:

روضۂ عالیہ میرزا کاظم است
آدمی چیست که شاید ملک آنجا خادم
بریاضت چوں ابوذر بتقاوت سلماں
ہمچو رستم بشجاعت بسخاوت حاتم
خود فرقان بسرو ورع احادیث به بر
زانکه اوبودباقلیم شریعت حاکم
بود درصنعت موجود وجود صانع
متفکر متدبر متامل دائم
بہررائے حکما بود حکیم حاذق
علم او بود زاسقام صحیح و سالم
خشک نان پارۂ شائگان تناول میکرد
ہمچو ماه رمضاں بود ہمیشه صائم
نفرت ازجملۂ لذّات جہاں فرموده
آنچه لازم نبود خود بگرفته لازم
گفت روح القدس درفکرسنین فوتش
یاالٰہی بجناں باد به موسیٰ کاظم (۷)

۱۲۴۹ھ

(۲۱) **میر خدا بخش:** آپ غفران مآب کے ان شاگردوں میں تھے جو عزاداری کے شغف میں صرف مشہور ہی نہیں بلکہ کربلائے تال کٹورہ ان کی حسینؑ دوستی کی تصویر آج تک لکھنؤ میں موجود ہے۔ اس مقدس عمارت کی بنیاد ۱۲۳۲ھ میں شفیق استاد کی زندگی ہی میں قائم کر چکے تھے، اس کربلا سے پہلے وطن مالوف میں دو کربلائیں بن چکی تھیں اور اس کی تاسیس کے بعد یہ مبارک سلسلہ عہد شاہی ختم ہونے تک تیزی سے جاری رہا اور شہر میں جابجا بلند مینار اور رفیع قبہ نظر آئے حتیٰ کہ خود نصیر الدین حیدر بہادر شاہ اودھ نے عالی شان کربلا بنوائی، مگر جو مقبولیت تالکٹورہ کو حاصل ہے کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ میر خدا بخش کا اخلاص اور غفران مآب کی طرف سے ان کے انتساب کا یہ ثمر تھا کہ دوسری صدی نصف سے تجاوز کر چکی ہے اور کربلا کی رونق میں یوماً فیوماً اضافہ ہے۔ عاشور اور چہلم اور ۲۱ ماہ صیام کے یوم غم اسی کربلا میں ہوتے ہیں۔ روضہ رواق اور خیمہ گاہ میں اب تک لاکھوں مجلسیں ہو چکیں اور کثیر تعداد میں اموات مومنین کربلا کی وقف زمین پر سپرد خاک ہیں۔ رواق کے شمال و مشرق کے گوشہ میں بانی کربلا کی قبر ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں۔ ان کی اولاد جرول وکنتور میں موجود ہے۔ اس کربلا پر سیر حاصل اور تاریخی بحث ہم نے اپنی کتاب تیرہویں صدی کے لکھنؤ میں کی ہے۔

(۲۲) **سید غلام حسین:** آپ نے بھی غفران مآبؒ کی حیات میں دنیا چھوڑی ''رَوْضَةُ الصَّالِحِیْنَ'' ان کی تصنیف اور تذکرہ بے بہا، ص: ۲۶۷ میں حالات زندگی ہیں۔

(۲۳) **سیّد شاکر علی**

(۲۴) **سیّد علی**

(۲۵) **الحاج نظام الدین حسین:** تذکرہ بے بہا، صفحہ ۴۲۲ میں ان کا حال دیکھو۔ جناب علیین

مکان ان کو طرد المعاندین میں فاضل معاصر کی لفظ سے یاد کرتے ہیں۔

(۲۶) مرزا جواد علی

(۲۷) سیّد بہاء الدین

(۲۸) سیّد علی اصغر

(۲۹) مولوی سید اعظم علی

(۳۰) ملا علی نقی قزوینی

(۳۱) مولوی علی نقی ابن بہاء الدین

(۳۲) مولوی بنیاد علی

(۳۳) مولوی امان علی

(۳۴) مولوی اشرف علی بلگرامی

(۳۵) مولوی محمد عبادت امروہوی۔

اطلاع: امامیہ مشن کے نشر کردہ مختصر سوانح حیات غفران مآبؒ میں تلامذہ کے ۴۱ ر نام ہیں جس میں سید مرتضیٰ اور حکیم مرزا علی نمبر ۲۰ و ۲۵، بظاہر مکرر ہیں۔ اس فہرست میں ہم نے آپ کے پانچوں صاحبزادوں کو بمفاد ؎

جگر جگر ہے دگر دگر ہے

شمار نہیں کیا ہے۔

اعتذار و اطلاع

آئینۂ حق نما[1]، ''تَذْکِرَۃُ الْعُلَمَاءِ، شَذُوْرُ الْعِقْیَانِ، مِرْاٰۃُ الْبِلَادِ ''وغیرہ جن

---

[1] حاجی داؤد لائبریری کراچی میں قلمی اور مکتبہ ممتاز العلماء لکھنؤ میں عہد مصنف کا خطی نسخہ سفید کاغذ زرد بارڈر موجود ہے۔

قدیم ماخذ سے حالات غفران مآب ترتیب دیئے گئے ہیں، ان کے علاوہ بکثرت جرائد، قومی اخبارات 'الواعظ' ۱۹۲۴ء میں 'المرشد' بغداد سے عربی میں کامیاب سیرت نگاری ہوئی۔ رجب ۱۳۴۹ھ ماہنامہ 'مبلّغ' لکھنؤ نے غفران مآب نمبر نکالا۔ ایک ادیب نے اپنی بھرپور علمی طاقت سے عربی میں معمہ ترتیب (دیا) جو اس عنوان سے ہے۔ ''لُغَزٌ فِیْہِ اسْمُ مُولَانَا دِلْدَار عَلِي ''میں یہ عربی جواہر پارے ایک سلک میں منسلک ہوں۔

اس کے بعد میں اتحاد بین المسلمین کو ٹھیس لگانے والی طاقتوں نے جب سر اٹھایا اور غفران مآب کی ذات پر حملے کئے تو مشیر[۲] نے دنداں شکن جواب دیئے اور شخصیت ممدوح کو اجاگر کیا۔ یہ وہ کمی تھی جس کا ایک سیرت پر اثر نہیں پڑ سکتا مگر مجھے دلی افسوس ہے کہ اس تذکرہ میں غفران مآبؒ کا عربی منظوم کلام پیش نہیں کیا جاسکا جو اپنے مقام[۳] پر موجود ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ پاکستان بساؤں گا۔ خداوند عالم ان مخطوطات کو ظلمت کدہ ہند میں اپنی حفاظت و حراست میں رکھے۔ قوم میں آسمان کے تاروں کی طرح بکثرت انجمنیں اور ادارے ہیں اور قائم ہوتے رہیں گے مگر ہیئت علمیہ ایسی نہ قائم ہوئی جو علمی آثار کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل کرے۔ غفران مآب کی مکمل سیرت سفر ہند کے بغیر مرتب نہیں ہوسکتی۔

مبلّغین اور واعظین کا تقرّر

تلامذۂ غفران مآب کی فہرست پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۰ رشاگرد جن کے نام واقعہ نگار ضبط و تدوین میں لا سکے، کسی ایک شہر کے باشندے نہ تھے۔ دور دراز مقامات سے نقل

وحرکت کر کے مجلس درس میں آئے تھے اوران میں کا ہر فرد جب فارغ التحصیل ہوکر اپنے وطن پہنچا تو تبلیغ دین میں وقف تھا، پھر بھی اشاعت مذہب حقّہ میں مبلّغین کی صوبہ وار ضرورت تھی۔ چنانچہ فیض آباد میں مولانا سید عبدالعلی صاحب دیوکھٹوی تشریف لائے جو خاندان پیش نماز فیض آباد کے مورث اعلیٰ ہیں، الہ آباد میں سبحان علی خاں جو علمی کمالات کے علاوہ ایک اعلیٰ سیاست داں اور عہدہ وزارت پر بھی سرفراز رہے، امروہہ ضلع مرادآباد میں غفران مآب سے اجازہ حاصل کرنے کے بعد مولانا سید محمد عبادت[1] صاحب مرحوم جمعہ و جماعت میں مشغول ہوئے، کنتور ضلع بارہ بنکی میں مولانا سید حمایت حسین عرف میر علی بخش صاحب، حیدرآباد دکن میں مولانا مرزا اسمٰعیل صاحب، میرٹھ میں مولانا مفتی سید محمد قلی صاحب نیشاپوری کنتوری، بلگرام میں مولانا اشرف علی،[2] مکہ معظّمہ میں مولانا مرزا محمد علی صاحب تاحیات مقیم رہے اور تعارف فقہ جعفری میں مطلق غفلت نہ کی، لاہور سے جب مولانا سید ابوالقاسم قمی[3] نے جناب سلطان العلماء سے امامت جماعت کا اجازہ حاصل کیا، تو پنجاب میں خدمات دینیہ کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور سندھ میں مولانا حشمت علی شاہ صاحب مرحوم ومغفور خیر اللہ پوری (تحصیل ناردوال ضلع سیالکوٹ) نے جو صاحب ''لَوَامِعُ التَّنْزِیلِ'' کے تلامذہ میں تھے، ہدایت کے چراغ روشن کئے اور پورا ہندوستان مذہب وملت کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔

عراق عرب میں خود غفران مآبؒ کے بیٹے مولانا سید علی صاحب قبلہ عتبات کی زیارت کو

---

[1] خلاصہ شمس التواریخ ص ۱۷، از حکیم نواب علی طبع گلزار ابراہیم

[2] عربی کی مشہور کتاب رِیَاضُ الْجِنَانِ فِي نَیْلِ مُشْتَهِيَ الْجِنَانِ آپ کے ہمنام ایک دوسرے عالم اشرف علی بن عبدالولی ۱۲۷۷ھ کی طبع شدہ تالیف ہے جس کے مصنّف غالباً حضرات بواہیر سے تعلق رکھتے ہیں۔

[3] دیکھو سوانح قاسمی طبع لاہور جو مولانا سید علی صاحب قبلہ حائری مرحوم ومغفور کے زیر سرپرستی شائع ہوئی۔

روانہ ہوئے اور موت کے ہاتھوں کربلا کی پاک زمین میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی یادگار کتاب تفسیر ''تَوْضِیْحُ الْمَجِیْدِ'' جو عہد شاہی میں بڑی تقطیع پر دو ضخیم جلدوں میں بہ زبان اردو طبع ہوئی۔ مُفَسِّر علّام کی وفات اور عدم موجودگی سے غیر شیعہ پریس میں چھپی اور افسوس کہ تحریف کی زد میں آ گئی۔ مولوی سید مہدی بن نجف علی نے تذکرۃ العلماء کے صفحات میں اس تلخ حقیقت کا اعلان کیا، حاجی داؤد ناصر لائبریری میں موجود ہے۔

وفات حسرت آیات

کامل ۳۵ ؍برس تک اس سحاب علم کے ترشّحات سے قوم سیراب ہوتی رہی۔ ۲۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۵ھ کو جبکہ آپ کی عمر میں پورے دو مہینے بھی باقی نہ تھے، وصیت نامہ لکھ کر اپنے خلف اکبر سلطان العلماء سید محمد (رضوان مآب) کو قائم مقام کیا۔ کتاب "اَلْوَصْلُ بَعْدَ الْفَصْلِ" میں یہ دستاویز ناظرین کو نظر آئے گا اور اس کے بعد ہی ۱۸؍رجب گذار کر انیسویں شب کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے امام باڑہ کے غربی حجرہ میں سپرد خاک ہوئے۔ وصیت نامہ کے علاوہ جو اجازہ بڑے بیٹے حضرت سلطان العلماء کو دیا اس میں یہی وصیتیں ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

"وعَلَیْكَ بِالْاِسْتِخَارَةِ اللهِ تَعَالیٰ سِیَّمَا فِی مَهَامِ الْاُمُورِ وَعِظَائِمِهَا فَاِنَّ الِاسْتِخَارَةَ سَبِیْلُ الرِّضَا وَعِصْمَةُ مِنَ الْخَطَاءِ وَ نُوْرُ بَیْضَاءَ بِهٖ فِی ظُلُمَاتِ الْحَیْرَةِ وَهُدًی یَهْتَدِی مِنْ حَیْرَةِ الضَّلَالَةِ"

''تم پر استخارہ بھی فرض ہے خصوصاً اہم اور بڑے کاموں میں اس لئے کہ استخارہ رضاے باری کی راہ اور لغزش سے بچنے کا ضامن اور ایک نور ہے جو حیرت کی

اندھیری میں روشنی پہنچاتا ہے اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو گمراہی میں راہنمائی کرتا ہے''

اطلاع۔ احکام اموات میں جو فرائض، تجہیز و تکفین کے موقع پر ہیں، ان کے علاوہ غفران مآبؒ نے قرآن مجید کے چند آیات شیشم کی تقطیع پر لکھوا کر اپنی قبر میں چہرہ کے سامنے رکھ دینے کی وصیت کی تھی اس کو میں ''اَلْبَلَدُ الطَّيِّبُ'' کے آخر میں خود سید العلماءؒ کے دست مبارک کا افادہ بچشم خویش دیکھ کر درج کیا ہے اور یہ بظاہر علم سینہ تھا۔ چونکہ عام اموات سے اس کا تعلق انہیں علماء سے خاص معلوم ہوتا ہے اس لئے اور نیز بخوف طول نظر انداز کیا، ان کی وفات سے ملت اسلامیہ کو عظیم نقصان پہنچا۔

۱۹ رجب ۱۲۳۵ھ میرے خیال میں ۱۰ رجنوری ۱۸۲۰ء سے مطابق ہے، ہندوستان کے محققین میں ایک شخص بھی ایسا نہیں گذرا جس میں ان کے مساوی علم وعمل کا مادہ موجود ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ غفران مآب ہی تھے جس نے ملک میں تبلیغ دین کی بنیاد ڈالی۔ وہ غفران مآب ہی تھے جس نے صوفیت و وہابیت و اخباریت کے مستحکم قلعہ منہدم کر کے امت مسلمہ کو دعوت اتحاد دی۔ اسی مراجعت نام کا اثر تھا، کہ ان کی وفات پر تمام جماعتیں اور گروہ مرثیہ خواں ہوئے۔ اسلامی ادارے مدتوں نوحہ گاہ بنے رہے، ہر درس گاہ میں عرصہ دراز تک صف ماتم بپا رہی اور تمام شعراء اور ادباء کے دماغ ہفتوں، مہینوں بلکہ برسوں ان کے تعزیتی اشعار اور مادہائے تاریخ کے لئے وقف رہے۔

قطعہ تاریخ

دنیائے ادب کے مشہور شاعر اور انشاء پرداز سید محمد اسمٰعیل منیرؔ کی دو تاریخیں ان کے

تاثرات کی تصویر کشی کرتی ہیں:

قبلۂ اہل حدیث و کعبۂ اہل کلام
روح قدسی، پیشوائے جن و انساں ہائے ہائے
جامع معقول و منقول، اشرف ابرار عصر
اعلم و افقہ، پناہِ اہل ایماں ہائے ہائے (۸)
نائبِ پاکِ ائمہ، بحرِ زہد و علم و فضل
میر دلدارِ علی، ہادی دوراں ہائے ہائے
اورع و اتقی، کلیم اوجِ طورِ اجتہاد
ہست تصنیفات او بیحد و پایاں ہائے ہائے
رنگ شبہات و خلل را آئینہ ملت زاد
بود صبح شرع را مہر درخشاں ہائے ہائے
دربہشت رود نزد اہل بیتِ مصطفیؐ
شہرعلم وعقل و دیں گردید و یراں ہائے ہائے
نظم کردم مصرعہ تاریخ رحلت اے منیرؔ
وارث علم پیمبرؐ اوجِ ایماں ہائے ہائے

۱۲۳۵ھ

دیگر

مقتدائے عارفانِ حق ملاذِ مومنین
ناصراسلام و دیں،حامی شرع اعتقاد
چھوڑ کر یہ عالم فانی گئے سوئے بہشت

ہوگئی روح مطہر خلعت رحمت سے شاد
دوسری تاریخ میں نے اور موزوں کی منیرؔ
ہائے بدر پاک دیں، مہر سپہر اجتہاد
۱۲۳۵ھ[۱]

ازواج واولاد

خلاّق عالم نے غفران مآب کو اولاد ذکور میں پانچ بیٹے عطا کئے اور سب مجتہد ہوئے اور ان کی اولاد میں بھی مجتہدین ہوتے رہے۔ غفران مآبؒ نے اناث میں ایک دختر چھوڑی جو اپنے بھائیوں میں مختلف البطن تھیں۔ شرح اولاد امجاد ملاحظہ ہو:

(۱) سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب خلف اکبر وقائم مقام غفران مآبؒ۔

(۲) سیّد المفسرین سیّد علی مفسر قرآن جنہوں نے مسجد تحسین علی خاں چوک لکھنؤ کو اغیار کے تسلّط سے واگذار کیا اور باقی عمر جوارِ سیّد الشُّہد اءرُوحِی فِدَاہُ میں بسر ہوئی، وفات ۱۲۵۹ھ

(۳) **سید حسن:** منجملہ تصانیف علم تجوید پر آپ کا وہ جامع رسالہ ہے جس نے ملک میں فن قرأت کا اساس قائم کیا۔ دنیا علم وعمل سے بہت دور ہوچکی، آج خوش الحان کو قاری کہا جاتا ہے، حالانکہ قاری علم تجوید کے ماہر کو کہتے ہیں جو تلاوت میں 'س' اور 'ث' میں فرق پیدا کرسکے۔

(۴) **سید مہدی:** جو زہد وورع تحقیق وتدقیق میں بے عدیل تھے اور جناب کے سامنے ۱۲۳۱ھ میں رحلت ہوئی، آپ کی رحلت کے دن سورج گہن تھا۔

(۵) **سید العلماء سید حسین علیین مکان:** بڑے بھائی کے سامنے مرجعیت حاصل تھی۔ غفران مآبؒ کے پائین پا حضیرہ میں انہیں کا مزار ہے جس پر ایک چوڑا چکلا سنگ مرمر نصب ہے۔ یہ

[۱] از کلیات منیر شکوہ آبادی، ص: ۵۹۶، المتوفی ۱۲۹۰ھ مطبع ثمر ہند لکھنؤ

پانچوں فرزند زوجۂ اولیٰ کے بطن سے اور حقیقی بھائی تھے جن میں کبھی اختلاف نہیں ہوا اور نمازوں میں دوسرے کی اقتدا کرتا تھا۔

(۲) صاحبزادیوں میں صرف ایک لڑکی نقیہ بیگم کنیز کے بطن سے تھیں جن کی شادی وطن مالوف میں ہوئی اور مرحومہ نے ایک لڑکی نقیہ بیگم چھوڑ کر رحلت کی جو سید جواد صاحب کو منسوب ہوئیں۔اولاد کا حال شجرہ خاندانی میں موجود ہے جس کے لئے متعدد صفحات درکار ہیں۔

نوٹ: غفران مآب کی زوجۂ ثانیہ نیکا بی بی سے کوئی اولاد نہ تھی۔وہ لاولد فوت ہوئیں۔

شکریہ اور شکایت ایک اہم انکشاف

مجھے روحانی مسرت ہے کہ علماء شیعہ پاکستان کے گذشتہ اجلاس کراچی ۵؍جنوری ۱۹۶۴ء کے خطبہ استقبالیہ میں جد مرحوم شمس العلماء سید محمد ابراہیم اعلے اللہ مقامہ کا تمثیلی عنوان سے ذکر آیا مگر واقعات صحیح نہ تھے جس کا بار مجلس استقبالیہ پر نہیں، حالات کی طرف رہنمائی کرنے والے کی ذہنی عادت یا لاعلمی، تہی دستی جس نے حقیقت کا رخ بدل دیا اور مقدمہ بلا فصل کو امام باڑہ آصفی کی واگذاری کا لباس پہنایا۔ یہ خطبہ کتابی شکل میں بڑی بھاری تعداد میں چھپا اور شیعہ اخبارات نے اول سے آخر تک چھاپا اور قوم کا بچہ بچہ ممدوح کی باعمل ذات سے ایک بار پھر واقف ہوا۔ میرے لئے مناسب نہ تھا کہ ہنگامی صورت میں اختلاف کرتا۔شکستہ خاطر ہونے کے بجائے تشکر و امتنان کی نگاہ سے اس اقدام کو دیکھا۔

"در عفو لذتیست که در انتقام نیست"

(معاف کرنے میں ایسی لذت ہے جو انتقام لینے میں نہیں ہے)

میری تشفی کے لئے یہ کافی ہوا کہ خود صدر اسلام میں باب ماضی ایک ایسے سرطان کی گرفت میں تھا کہ صادق آل محمد "رُوْحِی فِدَاهُ" کو کہنا پڑا "غَيِّرُوْا كُلَّ شَيْءٍ حَتّٰى هٰذَا"

ہر چیز کو تبدیل کر دیتیؓ کہ اس کو۔ اختلافات جو سماجی اور ثقافتی زندگی کے لئے تباہ کن ہیں، وہ کسی زمانہ میں بھی مستحسن نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ خدا وہ وقت لائے کہ جناب مرحوم کے حالات بھی نشر کر سکوں۔ حضرت قدس سرہ کے حالات ''کِتَابُ کَرِیْم فِی تَرجِمَۃِ اِبْرَاھِیْم'' کے نام سے ابتداء شباب میں قدیم طرز تالیف پر مرتب کر سکا ہوں، اس کے بعد حسب ذیل جرائد میں میرے قلم یا تعاون سے چھپے ہیں:

(۱) ریاضی جنتری ۱۹۳۱ء، چوک، لکھنو

(۲) صادق جنتری، رکاب گنج، ۱۹۳۳ء

(۳) اخبار 'سحاب' جوہری محلہ لکھنؤ مورخہ ۹/اپریل ۱۹۴۹ء

(۴) فہرست کتب جمعیت خدام عزا بابت ۱۹۴۷ء۔

حال میں welfred Scawen Blunt لندن کا ایک خط مورخہ ۱۲/جنوری ۱۸۸۵ء سمندر پار کے محافظ خانے چھاننے پر جناب مرحوم کے نام پر دستیاب ہوا ہے جس میں چرچل اول اور دوسرے یورپین کے نام اور مصر میں انگریزوں کی پالیسی کا بڑے شرح و بسط سے ذکر ہے۔ ۲۵۴ سطروں کا کون ترجمہ کرے؟ اتنا سرمایہ کہاں؟ یہ مواد یکجا ہو؟ ایک شیعہ گریجویٹ کو ترجمہ کے لئے نقل دی گئی تھی جو آج تک واپس نہ ہوئی۔ قوم کے کتنے خزانہ وہ تھے جو بے توجہی کی نذر ہو کر لٹ گئے۔ ذوق سلیم کہتا ہے کہ جب تک سیرت میں یہ اضافات اور اصل دستاویزات کی نقول شامل نہ ہوں دم نہ لوں: ؎

ہمدم چھٹے عزیز چھٹے اور وطن چھٹا
سب چھٹ گئے مگر نہ مذاقِ سخن چھٹا

آپ جناب غفران مآبؒ کے پروتے تھے اور صرف دو پشت کے فاصلہ سے غفران

مآب تک نسب شریف پہنچتا ہے۔ وہ صحیح جانشین اجداد ہیں۔ آج کی جوان نسل کی طرف سے کردار علماء کا سوال ہوتا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جب ایک ملک سے دوسرے ملک میں آج کے ایسے ریڈیو وغیرہ کے رابطے نہ تھے اور خبر رسانی جوئے شیر لانے کے برابر تھی، اس وقت پوری دنیا پر نظر رکھنا انہیں مفکرین کا کام تھا جو تن من دھن سب کچھ اپنے مقاصد کی نذر کر چکے تھے۔ نائب امام وہ تھے۔

تصانیف

غفران مآبؒ کے قلمی خدمات بڑی اہم حیثیت رکھتے ہیں جبکہ وہ معلم اول تھے۔ ان سے پہلے ملک میں نہ کوئی (امامیہ) کتب خانہ تھا، نہ کہیں تعلیم گاہ۔ وہ جو کچھ عراق وحجاز سے لائے اس کی حیثیت یہ نہ تھی کہ اس کو کتب خانہ سمجھا جائے۔ لکھنؤ پہنچ کر علوم وفنون کی کتابیں فراہم کرنے میں ان کو زیادہ سے زیادہ زحمت ہوئی اور جب اپنی نظر انتخاب سے اصول دین پر قلم اٹھایا تو بیشتر مصادر مآخذ، کتابت کی غلطیوں اور لکھنے والے کی لغزش قلم سے ناقابل اعتبار تھے۔ پہلے صحت کی، پھر میدان تالیف میں قدم رکھا اور جو کچھ لکھا وہ سابقین سے بڑھ نہ گیا تو کم بھی نہ تھا۔

(۱) عِمَادُ الاِسْلَامِ: اصول دین پر پانچ بڑی جلدیں تیار کیں جو علم کلام کا اعلیٰ شاہکار ہے اور جناب قُدوۃُ العلماء کے اہتمام سے زیادہ تر چھپ چکی ہے۔ امامت ومعاد زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے، عُمدَۃُ العُلماء نے اس اہم خدمت دین کی اشاعت پر توجہ کی تھی مگر بڑے سرمائے اور اشتراک عمل کی ضرورت تھی جس کا فقدان تھا۔ ان باوقار مجلّدات میں سے اس وقت میرے سامنے کِتَابُ العَدْلِ ہے جو جمادی الآخر ۱۳۲۰ھ میں

عمادالاسلام پریس، لکھنؤ سے فل اسکیپ سائز پر چھپی، زبان عربی ہے۔

(۲) شَهَابٌ ثَاقِبٌ: صوفیوں کی رد میں بڑی ضخیم تالیف ہے جو طبع نہیں ہوسکی، موضوع پر اس سے بہتر عربی میں کتاب نہیں۔

(۳) ذُوْالْفِقَار: تحفہ کے بارہویں باب کی رد، لدھیانہ میں ارسطو جاہ کے پریس میں چھپی۔

(۴) صَوَارِمُ الِالٰهِيَاتِ: تحفہ کی رد میں یہ کامیاب شاہکار بھی معرض تحریر میں آیا، مکتبہ ممتاز العلماء میں علاوہ قلمی نسخوں کے کلکتہ کا طبع شدہ ایڈیشن بھی ہے۔

(۵) حُسامُ الْاِسْلَامِ: تحفہ کے باب نبوّت کا جواب۔

(۶) تَتِمَّةُ صَوَارِمِ در امامت۔

(۷) اِحْيَاءُ السُّنَّةِ: باب ہشتم کتاب مذکور کی رد، اور مبحث معاد و رجعت میں ہمارا نظریہ۔

(۸) رسالہ غیبت: نواصب کی رد میں، بڑی تشفی بخش کتاب، شاہی مطبع میں چھپی۔

(۹) اَسَاسُ الْاُصُولِ: اخباریوں کی رد میں بے پناہ تصنیف جو ۲۵/صفر ۱۲۶۲ھ مطبع حاجی ولی محمد لکھنؤ میں طبع ہوئی، مکتبہ ممتاز العلماء میں اصل نسخہ بحمدہ موجود ہے۔

(۱۰) مَوَاعِظ حُسَيْنِيَّه

(۱۱) شَرْحُ حَدِيقَةِ الْمُتَّقِيْن: طہارت صوم و زکوٰۃ میں، تین جلدیں بہ زبان فارسی

(۱۲) رسالہ جمعہ

(۱۳) حَاشِيَةُ صَدْرَا

(۱۴) بَحْثُ مُثَنَّاةٍ بِالتَّكْرِيْرِ

(۱۵) مُنْتَهَى الْاَفْكَارِ: اصول فقہ کی ایک ٹھوس کتاب جو انجمن یادگار علماء لکھنؤ نے تصویر عالم پریس میں طبع کی، پریس سے اس کی بھی تکمیل نہیں ہوئی۔

(۱۶) اِثَارَۃُ الْاَحزانِ عَلیٰ قَتِیْلِ الْعَطْشَانِ: عربی کا بلند پایہ مقتل۔

(۱۷) مُسَکِّنُ الْقُلُوبِ عِنْدَ فَقْدِ الْمَحْبُوبِ: انبیاء و اوصیا کے مصائب و آلام ضخیم عربی کتاب۔

(۱۸) حَوَاشِی حَمْدِ اللّٰہِ: عہد شاہی کے نسخۂ مطبوعہ پر آپ کے تبصرے۔

(۱۹) اِجَازَۃٌ بِحَقِّ سُلْطَانِ الْعُلَمَاءِ: علم حدیث اور رجال کے حقائق اور وصایا اپنا سلسلۂ روایت۔

(۲۰) رسالہ در جواب سوالات محمد سمیع صوفی۔

(۲۱) رِسَالَۃُ اَرَضِیْنَ: جس میں مختلف قسم کی اراضی کی ملکیت کے احکام ہیں جسے اَرْضِ مَفْتُوحَۃٍ عَنْوَۃٍ یعنی جو زمین بغیر جنگ کے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے یا وہ اراضی جو بطور جاگیر بادشاہ وقت سے حاصل ہو۔

(۲۲) رِسَالَۃٌ ذَهَبِیَّۃٌ

(۲۳) رسالہ ردِّ نصاریٰ

(۲۴) مَطَارِق

(۲۵) رِسَالَۃُ اَدْعِیَۃِ کَفَن: تمام تصنیفات مکتبۂ ممتاز العلماء لکھنؤ میں موجود ہیں۔

(۲۶) اَسْئِلَۃٌ وَاَجْوِبَۃٌ: یہ گرانقدر تصنیف صوفی حضرات کے سولات پر غفران مآبؒ کے بسیط جوابات ہیں، بزبان فارسی، ۲۶x۲۰-۱x۴، ۵۰ صفحات قلمی نسخہ میرے کتب موقوفہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ میں موجود ہے۔

اس کے علاوہ وہ بے شمار استفتاء اگر یکجا کئے جائیں جو آپ نے مسند شریعت پر پہنچ کر مختلف استفسار کرنے والوں کے جواب میں حوالۂ قلم کئے اور دستخط کردہ مسائل کے تمام

جوابات ضبط تحریر و تدوین میں آئے، تو کئی جلدیں تیار ہو جاتیں۔ یہ بکھرے ہوئے موتی جس کی ضرورت کے تھے اس کے دامن امید میں رہے اور مرکز پر اس کی کوئی نقل کبھی نظر نہ آئی۔

اطلاع: غفر ان مآبؒ کے پانچ بیٹوں میں تین صاحبزادوں کی اولاد میں سلسلہ اجتہاد اور علم اب تک باقی ہے۔ ۱۳/سال پہلے اس کتابچہ کے پہلے اڈیشن میں ۲۵ نام اولاد امجاد کے پیش کئے تھے جن میں بعض کی وفات ہوئی اور بعض نے طالب علمی ختم کر کے اس خلاء کو پورا کیا۔ چنانچہ اس وقت جو اہل علم و کمال و مجتہدین رشد و ہدایت، تالیف و تصنیف، جمعہ و جماعت، وعظ و نصیحت اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، ہند و پاک، عراق و ایران میں ۲۶/افراد ہیں اور بزرگ خاندان قومیات میں اپنی عمر صرف کرنے والے سید محمد رضی صاحب شگفتہؔ کراچی میں ہیں اور کل اولاد غفران مآبؒ کا اگر چہ تخمینہ نہیں ہوا مگر بچہ و مرد و عورت پانچ سو نفوس تو یقیناً ہوں گے جو ممالک اسلام کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں بھی عارضی قیام کئے ہوئے ہیں اور مورث اعلیٰ کے تبرکات والد ماجدؒ کے پاس خلف اکبر ہونے کی حیثیت سے نسلاً بعد نسل محفوظ تھے اور اب اس خادم دین کے پاس کلاہِ غفران مآبؒ، قباء علیین مکان، عباء فردوس مکان اور ان حضرات کی خطابی مہریں سلاطین اودھ و عہد انگریزی کے تمغۂ فرامین اور ان حضرات کے خطی نسخہ اور تصانیف کے اصل مسودہ صاحب جواہر الکلامؒ کے مکاتیب بحمد اللہ کامل حفاظت سے موجود ہیں اور کتب خانہ جو وقف ہے اس میں شامل ہیں۔

حال میں ایام عزا کے مجالس میں بسلسلہ اسلام اور علماء ایک پمفلٹ بالکل غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر شائع ہوا جس میں تحریر تھا کہ معاذ اللہ غفران مآب نے محسن فیض کاشانی رحمۃ اللہ علیہ کے کفر کا فتویٰ دیا۔ جب مشتہرین سے خط و کتابت میں تصانیف غفران مآب کا حوالہ طلب کیا گیا تو انہوں نے تصانیف کا حوالہ دینے کے بجائے مسموعات (سنی ہوئی باتوں) کی نشان دہی

کی اور ایک عظیم شخصیت کو سوءِ ظن سے بچایا جس کا میں شکر گزار ہوں۔

غفران مآبؒ کا جن کتابوں میں نام ہے

قارئین کرام پونے دوسو برس ہونے چاہتے ہیں اس طویل مدّت میں عربی، فارسی، اردو، سندھی کتب میں کہاں کہاں ان کا نام نامی ہوگا، اس کے شمار کے لئے ایک کارکن کمیٹی کی ضرورت تھی جو اپنی رپورٹ مجھ تک پہنچاتی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے جو غور کیا تو صرف ۲۵ کتابیں یاد آسکیں، طلبہ اور مصنفین کو کام کا طریقہ بتانے کے لئے یہ ناقص عنوان مدد دے گا۔

(۱) منطق کی باوقار کتاب حمد اللہ،، عہد شاہی کی چھپی ہوئی سپید کاغذ اس کے حواشی پر نام موجود ہے۔

(۲) مِعْرَاجُ الْعُقُولِ، شرح دعائے مشلول فاضل سید مرتضیٰ زنگی پوری نے اگر چہ اختلاف کیا ہے اور اس کا جواب عربی زبان میں چچا جان اَعلیٰ اللہُ مَقَامَہُ نے بھائی صاحب مرحوم کے نام سے دیا، میں نے اپنی طالب علمی میں خود جناب کی زبان سے اس کے مقامات سنے اور ایک فلسفی کی تحریر کا اصولی کے قلم سے جواب، تصانیف شیعہ میں گرانقدر اضافہ ہے۔

(۳) بَرَاهِيْن سَابَاطِيَة، مطبوعہ قدیم صفحہ ۲۳

(۴) نَصْرُ الْمُؤمِنِيْنَ فِي تَفْضِيْلِ رَسُولِ الْاَمِيْن، مفتی میر عباس صاحب چھاپہ صفحہ ۳۰ و ۴۳

(۵) اَحْسَنُ الْوَدِيْعَةِ مُسْتَدْرِكُ رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ، عربی طبع نجف اشرف

(۶) اَلْمُرشِدُ، عربی مجلہ بغداد مورخہ رمضان ۱۳۴۶ھ

(۷) مِرْآةُ الْبِلَادِ، ہاشم علی رضوی فارسی مطبوعات

(۸) نُوْرُ الْاَخْبَارِ فِي تَارِيْخِ النَّبِيِّ وَآلِهِ الْاَخْيَارِ، مولوی علی نقی حائری فارسی ص ۱۱ طبع بمبئی

(۹) تَذۡکِرَۃُ عُلَمَاءِ ھِنۡدِ، مولوی رحمٰن علی طبع کراچی، ص ۱۸۶
(۱۰) عُلَمَاءِ عَھد بَنۡگش، مترجمہ حکیم شرف الزماں طبع ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۸ طبع پاکستان
(۱۱) تَنۡزِیۡہُ اَلۡاَنۡسَابِ، جلد دوم مولوی ماہ عالم، ص ۵۷ نور المطابع
(۱۲) کَشۡفُ الظُّلُمَاتِ عَنِ الۡآیَاتِ الۡبَیِّنَاتِ، مولوی سید محمد مہدی، ص ۴ طبع ۱۹۳۵ء
(۱۳) کلیات منیرؔ شاہ آبادی
(۱۴) عِمَادُ السَّعَادَۃِ، ص ۱۵۶، طبع مطبع نول کشور ۱۸۶۴ء
(۱۵) آب حیات، منشی محمد حسین آزادؔ
(۱۶) انتصار الاسلام، علامہ غلام حسنین کنتوری
(۱۷) کنتاپ، میاں مشیرؔ مرحوم طبع اثنا عشری پریس لکھنؤ، ص ۱۱۶
(۱۸) رقعات مرزا قتیل، طبع قدیم فارسی
(۱۹) زَادُ الصَّالِحِیۡنَ، مولوی سید محمد مہدی سرسوی، ج ۸ ص ۲۳۹
(۲۰) ذَرِیۡعَۃُ اِلٰی تَصَانِیۡفِ الشِّیۡعَۃِ، ج ا ص ۱۹۱ عربی طبع نجف اشرف
(۲۱) تاریخ اسلام، ذاکر حسین دہلوی، ج ۵، اردو ص ۴۷
(۲۲) تاریخ اودھ، نجم الغنی حصہ سوئم، ص ۲ ۱۳، نول کشور
(۲۳) تحفہ احمدیہ، بحث زکوٰۃ، ج ا، مطبع مرتضوی لکھنؤ
(۲۴) بادشاہ بیگم، محمود عباسی، طبع کراچی، ص ۷ ۱۳،
(۲۵) ملاقات امام، مولانا سید محمد مجتہد امروہوی مرحوم، ص ۱۶۱۔
(۲۶) تذکرہ ناصر الملۃ از ملا احمد حسن کاظمینی مرحوم نظامی پریس۔

تاریخ ہائے وصال علماء کرام

ذیل میں اولاد غفران مآبؒ کے مشاہیر علماء کی ایک فہرست حاضر ہے تاکہ ارباب عقیدت اس تاریخ، تلاوت قرآن سے مقدس ارواح کوشاد کریں۔اس سلسلہ کی کتابیں چھپنے پر نماز شب میں ان حضرات کے ناموں کے ذکر کی اطلاع آچکی اور جن حضرات نے ۱۹رجب کو ایصال ثواب کی مجلس کی وہ بھی میرے شکریہ سے برتر ہے۔توقع ہے کہ تلامذہ اپنے اساتذہ کی تاریخوں کوفراموش نہ کریں گے:

۱۹رجب: استاذ الکل سید دلدار علی غفران مآبؒ، برصغیر کے پہلے مجتہد جن کی تبلیغ اور نسل، امام باڑہ، مسجدین اور تصانیف اب تک باقی ہیں، ان کی لائف کا دوسرا اڈیشن حاضر ہے۔

۱۷رصفر: سید العلماء سید حسین علیین مکاں — ''اَوۡرَاۡقُ الذَّھَبِ'' عربی لائف کا ایک نسخہ کراچی میں موجود ہے۔

۲۲ربیع الاول: سلطان العلماء سید محمد رضوان مآبؒ۔بسیط سوانح حیات پیش کی جا چکی۔

۲۴رمضان: ممتاز العلما فخر المدرسین سید محمد تقی جنت مآبؒ، آپ کا ٹرسٹ لکھنؤ میں پرا میسری نوٹ مسجد امام باڑہ، مقابر کی صورت میں ہیں۔اِحْیاءُ الآثار سوانح عمری کا نام ہے۔

۲رمضان: زبدۃ العلماء معین المومنین سید علی نقی مرحوم ومغفور۔۔۔۔خطوط غالب' اردوے معلیٰ' میں ص:۲۸۹، ۲۸۶، مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۸ء میں ذکر ہے۔

۲۰رجمادی الاولیٰ: شمس العلماء سید محمد ابراہیم فردوس مکان — اذان میں کلمہ بلافصل آپ کی جدوجہد سے جاری رہا کرنیل نیوبری کے احتجاج سوانح میں دیکھو۔

۱۷رصفر: ملاذ العلماء سید ابو الحسن عرف بچھن صاحب قبلہ — فلسفہ وحکمت میں یگانہ

روزگار۔

مولانا سید ظہور الحسن میران پوری بارہوی وغیرہ کے استاد۔

۴ ربیع الآخر: تاج العلماء سید علی محمد مرحوم ـــ لاتعداد کتابوں کے مصنف اردو کے پہلے حامی اور ترجمہ قرآن ان کی یادگار ہے، عبرانی زبان پر بھی عبور تھا۔

۱۱ رمضان: عماد العلماء میر آغا مجتہد ـــ مسئلہ مسائل میں ڈاک یکّہ پر جاتی تھی۔ جب تک زندہ رہے برصغیر میں علماء عراق کی تقلید نہیں ہوئی۔ ''چراغ ہند گل'' (۱۳۱۳ھ) تاریخ ہے۔

۲۷ رجب: بحر العلوم سید محمد حسین عرف علّن صاحب قبلہ ـــ ذاکری کو علمی لباس پہنایا............

۵ محرم: فردوس مقام مولانا سید محمد تقی صاحب قبلہ ـــ اپنے دادا کے وقف خاص کو مرتے دم تک وقف عام نہ کہا اور بورڈ آف ٹرسٹیز کو تسلیم نہیں کیا حتی کہ بورڈ نے ۵۰ سال بعد تلافیٔ مافات کی۔ مختصر لائف ''تَذْكِرَةُ الْمُتَّقِيْنَ'' قوم کے سامنے لائی گئی، مولانا سید ثاقب حسین صاحب امروہوی پروفیسر جوبلی کالج ارشد تلامذہ میں موجود ہیں، آپ نے ''مَعَالِمُ الْاُصُوْلِ'' کا اردو ترجمہ کیا۔

۷ ربیع الآخر: قدوۃ العلماء سید آقا حسن مجتہد ـــ شیعہ کانفرنس، شیعہ یتیم خانہ، قوم میں بیداری کی روح پھونکنے والے، ماہنامہ معالم اور ہفتہ وار الناطق کے بانی۔

۱۶ شعبان: سید محمد باقر مجتہد ـــ اپنے دور کے ہر صدر الا فاضل کے استاد جامعہ سلطانیہ کے مدرس اعلیٰ۔

۲۹/ذیقعدہ: مولانا سید ابوالحسن ' پرنسپل ' مدرسہ واعظین —— مولانا سید انیس الحسنین، مولانا حافظ کفایت حسین، مولانا محمد بشیر انصاری، مولانا لقاء علی حیدری وغیرہ کے استاد۔

۸/جمادی الآخر: سید سبط حسین —— مجتہد اعظم اور فن طب کی بہت بڑی ہستی، ذیابیطس کے ماہر، شعروسخن میں میر زمانہ۔

۲۶/شعبان: شمس العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ مجتہد —— قدیم ذاکری کے خاتم، لحن داؤدی کے واحد مظہر، شیعہ کانفرنس کو صدارت کی عزت دی، آپ کا کتب خانہ اور گھر ۸/ربیع الاول کے یوم غم میں فرقہ وارانہ فساد میں جلا دیا گیا۔

۲۷/رجب: مولانا سید محمد عرف میرن صاحب قبلہ —— کراچی میں تلامذہ آپ کے موجود ہیں۔

۱۷/جمادی الاول: عمدۃ العلماء سید کلب حسین —— ذاکر شام غریباں و امام جمعہ مسجد آصفی۔ ان کی خطابت سے چپہ چپہ ملک کا آشنا ہے۔

اولاد غفران مآبؒ کے فرائض

(۱) جملہ افراد خاندان کو اس بات پر خاص توجہ کرنا چاہیئے کہ ہماری کیا تعداد ہے؟ ہر نسل کا بزرگ اپنے لواحقین کے نام اور پتہ لکھ کر حضرت شگفتہ لکھنوی کی خدمت میں بھیج دے۔

میرے دوست سید محمد شبیر صاحب نقوی کو سامرّہ میں ایک بزرگ درویش صفت ملے اور اپنا نام احمد علی بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اولاد غفران مآبؒ سے ہیں اور مدت دراز سے عربستان میں آباد ہیں، لیکن پہچاننے سے قاصر رہا مگر انکار بھی نہیں کرسکتا۔

(۲) نئی نسل میں آبائی تعلیم کا رجحان پیدا کرنا اور اپنے وظیفہ سے کم از کم ایک طالب علم کو عراق روانہ کرنا اور اس کی تکمیل کو کامیاب بنانا۔

(۳) ان حضرات کی شخصیت پر غلط آوازوں کا جواب دینا اور صحیح سیرت پیش کرنا اور تصحیح سے بجائے آزردہ خاطر ہونے کے خوش ہونا ۔ جیسے منصف الدولہ بہادر کی کربلا وہ مقدس عمارت ہے جو بعد میں کربلائے عظمت الدولہ سے مشہور ہوئی ۔ یہ سمجھنا کہ دیانت الدولہ کی کربلا منصف الدولہ کی کربلا ہے، غلط ہے۔

نتیجہ کلام

آپ نے ملاحظہ کیا کہ کتنے مقامات پر میں نے منقولات کو حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے اور عبارتیں نقل نہیں کر سکا۔ اجازات غفران مآبؒ اور ان کے معاصرین کے حالات اور ترک کردہ مقامات، اگر اس مختصر لائف میں یکجا کرتا تو دو سو صفحہ ہوجاتے۔ کاغذ اور سامان طباعت کی ہوش ربا گرانی میں بھلا کہاں ممکن تھا۔ جو سبق ہم کو اس سیرت کے پڑھنے سے حاصل ہوتے ہیں، ان میں سب سے بڑا درس سنی شیعہ علماء کا اتحاد عمل ہے۔ ایک دستاویز پر علماء فریقین کی دستخطیں ہوتی تھیں اور نہ ضرورت مند کو مغایرت محسوس ہوتی تھی، نہ وہ حضرات کسی کی تصدیق میں پہلو تہی کرتے تھے۔ صوفیت کی رد اور اخباری طبقہ کا انتباہ، نواصب کی تحریروں کا ابطال ایک علیحدہ شئے، آپس کا باہمی مسئلہ ہے۔ سچّے مسلمان وہی تھے جو شیر و شکر تھے۔ یہ اضافات بھی ہنگامی صورت میں ناچیز کے قلم سے اس وقت ہوئے ہیں، جب تین کتابیں بیک وقت زیر طبع ہیں اور میں حمد معبود پر قلم روکتا ہوں۔ تحریر میں بسط نہ ہوسکا تو ایک ملیح آبادی کا شعر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا نتیجۂ فکر ہے ؎

کام ماگر تر نہ شداز آب مقصد عیب نیست
زانکہ اولاد حسینم تشنگی میراث ماست(۹)

۱۶؍صفر ۱۳۹۶ھ

آئینۂ حق نما

حالات غفران مآبؒ میں یہ ضخیم کتاب زیادہ سے زیادہ مشہور اور فارسی کا قدیم شاہکار ہے جو خود ان جناب نے سیرت علماء کے مطابق بزبان غیر سپرد قلم فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض سیرت نگار فہرست تصانیف میں اس کو شمار نہیں کرتے مگر جد امجد جناب سید العلماء علیین مکانؒ نے اپنے سگے بھتیجے عمدۃ العلماء سید محمد ہادی رحمہ اللہ کو جو اجازہ مرحمت کیا اس میں اپنے والد علام کے ذکر تصانیف میں ''آئینۂ حق نما'' کو ۲۳واں شاہکار قرار دیا ہے اور مناظروں پر مشتمل ہونے کی خصوصیت کو نمایاں الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کے چند نسخہ اطراف ملک میں تھے۔ جناب زبدۃ العلماءؒ کا خطی نسخہ زنگی پور میں مولانا سید محمد یوسف صاحب مرحوم کے بزرگوں کے پاس یادگار صحیفہ اور ایک نقل جناب فردوس مکانؒ نے اپنے کسی مخلص مولوی حسین مرزا نامی کو دی اور بھی نقول علمی مراکز میں ہوں گے۔

امام باڑہ غفران مآبؒ پر میرا مقالہ اخبار 'خطیب' کراچی عمدۃ العلماء نمبر جلد ا، شمارہ ۱۱، صفحہ ۳۰؍ پر چھپا۔ طول کلام کے خوف سے اسکی بھی نقل سے معذور ہوں۔

غفران مآبؒ کے دیسہ کی مجلس میری اوائل عمر عہد جناب علّن صاحب قبلہ مرحوم تک ۱۹؍ رجب کو ہوتی ہے اور لکھنؤ کے رواج کے مطابق گھروں پر شیر مالیں تقسیم ہوتی تھیں۔ عزیزوں میں جو اس سال فوت ہو جائے اس کی بیوہ کو تبرک پہنچانا لازم تھا۔ جناب کے بعد مجلس مسمّٰی ہو کر رہ گئی۔

ایک زلزلہ افگن مگر تحقیق طلب خبر

گذشتہ ۶۰ برس کے علمی خدمات میں یہ اطلاع مجھے تڑپا کر رہ گئی کہ بالاکوٹ کے سید احمد شہید جو ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے، آزادی کا سودا لے کر وطن چھوڑ کر مسلمانوں کو بلند کرنے میں

جہاد کرتے ہوئے بالا کوٹ میں شہید ہو گئے۔ ان کا سلسلہ نسب کچھ پشتوں کے بعد جناب غفران مآب کے اجداد تک پہنچتا ہے۔ اس مجاہد اعظم پر جو کتابیں پاکستان میں لکھی گئی ہیں اس کو اگر میرے عزیز ترین بھتیجے مولوی سید علی لکھنؤ یونیورسٹی سے نہ پا سکے اور میں بستر مرض پر آخری منزل میں ہوں، زمانہ ترقی کرتا جا رہا ہے، میں نہ سہی تو میری نسل میں باقر حسین، (بی ایس سی) اور عابس حیدر (شپ اونرز) کالج سے نکل کر میدان تحقیق میں قدم رکھیں تو فضل خدا سے دور نہیں یا علی آصف اور ان کا کوئی بھائی یا نائیجیریا کا چھوٹا بچہ مسلم یا علی فراز ہزار جلدوں کی کتب بینی کرنے کے بعد انشاء اللہ سید احمد شہیدؒ کی اس تقریر تک پہنچیں جس میں انہوں نے قوم کو بیدار کرنے میں مولانا دلدار علیؒ کا نام لے کر ہمت بڑھائی تھی۔ یاد رہے علم محدود نہیں ہے۔ ملک میں تحقیقات کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ مصنف کو خدا پر بھروسہ اشد ضروری ہے۔

آغا مہدی

۲۷ / ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ

النجف ۷۔ ۱۴۲ / ۱۷، فیڈرل بی ایریا، کراچی

آل غفران مآبؒ کی قبریں

یہ عنوان باب ماضی کی یاد اور تاریخ کو زندہ رکھنے کا وہ زریں باب ہے جو میرے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، رب کا تصور اور ان کی بلند و بالا ذہنیت کی تصویر کشی ہے، جس کو قرآن حکیم نے بھی اپنی تفسیروں میں اشارہ کیا ہے اور سورہ تکاثر ثبوت میں موجود ہے۔ عرب کے دو قبیلے ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے جذبے میں کہہ رہے تھے کہ ہم تم سے بہتر ہیں اس لئے کہ (قبرستان چلو اور شمار کرو ہماری قبریں تمہارے قبیلے کے قبروں سے بہت زیادہ ہیں) یہ دعویٰ ان کا بڑی حد تک صحیح تھا۔ اسلام نے مسلمانوں کی تعداد بڑھانے پر زور دیا۔ چار نکاحوں

کی ہر شخص کو اجازت دی اور نکاح منقطع کی کوئی حد نہیں۔ اپنی قوت اور امکانات کے لحاظ سے متعہ کیجئے۔ قرآن حکیم کے شروع ہونے والے پاروں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ کوئی ناسخ متعہ کا آج تک کسی مخالف نے پیش نہیں کیا۔ علاوہ عقلی اور نقلی مصلحتوں کے سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ مسلمان اکثریت حاصل کریں۔

منصوبہ بندی ایک فریب اور انسانیت کش قانون ہے جس کو سادہ لوح دنیا اختیار کرتی جاتی ہے۔ انسانیت کی بقا عقلی مقصد ہے۔ مگر یہ بھی روشن حقیقت ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ وہ کس زمین پر دم توڑنے والا ہے۔ عرب کی دنیا محدود زمین پر آباد تھی۔ وہ قبروں کو شمار کر سکتے تھے۔ ہم جس بلند و بالا ذات پر قلم اٹھا رہے ہیں اس کی اولاد پر اگر غور کرتے ہیں تو دنیا کے اکثر شہروں میں انتقال کر کے دفن ہو چکی ہے۔ اور وہ صرف امام باڑہ غفران مآبؒ اور حسینیہ ممتاز العلماءؒ چوک، لکھنؤ میں محدود نہیں۔ چنانچہ بڑی کاوش کے بعد جب ہم فکر رسا سے کام لیتے ہیں، تو حسب ذیل شہروں میں یہ حضرات دفن ہیں:۔

مکہ معظّمہ

اس مقدس زمین پر مولوی سید غلام عابد صاحب مرحوم و مغفور سپرد خاک ہیں جو صرف حج کی عزت حاصل کرنے پر وہاں فوت ہوئے۔ جہاں تک میری یاد ساتھ دیتی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں والد ماجد نے خواب دیکھا کہ ایک میدان میں دو جنازے کثیر مجمع کے ساتھ نظر آ رہے ہیں کہ ایک تابوت مومنین کے اژدہام میں قریب ہے اور ایک دور سے نظر آ رہا ہے۔ اس بات کے عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ پچھتر برس پہلے حاجیوں کے قافلے طیارے پر تو جاتے نہ تھے، بحری سفر کے بعد قاتر، گدھے اور اونٹوں پر قافلہ روانہ ہوتا۔ مولوی صاحب موصوف کے ساتھ لکھنؤ کے مسافروں نے ڈاکٹر مرزا اعجاز حسین صاحب مرحوم، ساکن حیدر گنج، لکھنؤ کے بڑے

بیٹے تھے کچھ عشرہ محرم گذرنے پر خبر آئی کہ یہ دونوں صاحبان انتقال کر گئے اور اس پاک زمین پر دفن ہوئے۔ یہ تھی تعبیر میرے والد کے خواب کی، قریبی تابوت سے مراد میرے والد کے چچا کا جنازہ تھا اور دور کے تابوت سے مراد ان کے ہم عصر اور دوست ڈاکٹر صاحب کے بیٹے کی میت تھی۔ مولوی صاحب موصوف بڑے مقدس اور متقی انسان، ان کا قیام میرے قدیم مکان سے دیوار بیچ تھا۔ وہ بڑے نماز گزار سن رسیدہ لحیم شحیم مرد مومن تھے۔ امام باڑہ کی روز عاشور وقت عصر کی مجلس کتاب دیکھ کر وہی پڑھتے تھے۔ ۱۹۰۴ء کے فرقہ وارانہ فساد میں نہ پہنچ سکے تو والد ماجد کے حکم سے میں نے پہلی مرتبہ ذاکری کا شرف حاصل کیا۔ اور اس زمانے کی مقبول کتاب مجالس شیعہ اردو سے ذوالجناح کا درخیمہ پر آنا پڑھا۔ خداوند عالم ان مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ ان کے بیٹے مولوی سید محمد عابد صاحب اس مکان کے رہنے والے با قاعدہ ذاکر تھے اور مدرسہ سلطان المدارس کے معلم اطفال رہے۔ اس زمانے کے سینکڑوں شاگرد چھوڑے۔

عراق

نجف اشرف و کربلائے معلیٰ میں تو اولاد غفران مآبؒ کے کئی مقدس نفوس اور کچھ بچے اولاد غفران مآبؒ کی طالب علمی میں سپرد خاک ہوئے۔ جس میں پہلے مولانا سید علیؒ صاحب جن کی اردو تفسیر 'تَوْضِيحُ الْمَجِيدِ' آج موجود ہے۔ آپ غفرانمآبؒ کے بڑے بیٹے سے سن میں چھوٹے صاحبزادے تھے۔ زیارت کو روانہ ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا اور آج ان کی اولاد لکھنؤ اور کراچی میں موجود ہے۔

دوسری قبر معین المومنین زبدۃ العلماء سید علی نقی صاحب قبلہ کی اہلیہ محترمہ قمر النسا بیگم کی ہے جو میری دادی کی والدہ تھیں اور سلطنت اودھ کے اقتدار میں عراق پہنچ کر انتقال ہوا، حضرت

حبیب ابن مظاہر کے پائین پا دفن ہوئیں۔

بحر العلوم سید محمد حسین عرف علن صاحب قبلہ مجتہد مرحوم کے بیٹے سید محمد عرف آغا جو تحصیل علم میں لکھنؤ سے روانہ ہو کر گئے تھے، یہ میرے بچپن کا زمانہ ہے اور میں مرحوم کو پہنچانے کے لئے (ہائے کراچی! میں اس مقام پر چھوڑنے گئے تھے جو زبان پر ایک ضرب ہے!!) چار باغ اسٹیشن گیا تھا۔ اس وقت حاضرین میں سہارنپور کے خواجہ محمد مختار احمد صاحب کو میں نے پہلے پہل دیکھا تھا۔ گاڑی چھوٹی اور وہ مدتوں تک تحصیل علم میں مشغول رہے۔ ان کی مالی حالت خاندان میں سب سے بہتر تھی۔ خوش پوشاک تھے اور طلباء ان کو رئیس العلماء کہتے تھے۔ تکمیل سے پہلے اسی مقدس زمین پر عالم شباب میں انتقال کیا۔

ان کے علاوہ میرے دور میں مولانا سید محمد باقر صاحب قبلہ اور ان کے خاندان کے بہت سے افراد دفن ہیں۔ کچھ کی لاشیں ہندوستان سے کربلا گئیں۔

کراچی

قدیم ہندوستان کا ساحل سمندر پر وہ چھوٹا سا شہر ہے جس کو کراچی بندرگاہ کہا جاتا ہے اور عراق کے زائر بمبئی سے روانہ ہو کر جہاں جہاز ٹھہرتا۔ اور زائر ہندوستان کی آخری بستی سے گذر کر بحیرہ عرب روانہ ہوتا، جو ایک عظیم الشان شہر ہے اور پورے ہندوستان سے لوگ ہجرت کر کے وطن بنا چکے اور تمدن وتہذیب کے لحاظ سے یورپ کے شہروں سے مقابلہ کرتا ہے۔ اس قدیم بستی میں ستر سال سے پہلے ایک قبر اس کیفیت سے قرار پائی کہ میری حقیقی پھوپھی اپنے پورے گھر کی موت کے بعد لکھنؤ چھوڑ کر کربلا روانہ ہوئیں۔ یہ ۱۳۲۷ھ کا واقعہ ہے اس وقت شمس العلماء سید ابن حسن صاحب مرحوم اور بہت سے افراد خاندان سفر زیارت میں طول ہو کر مقیم تھے کہ یورپ کی جنگ عظیم شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ سب کو لکھنؤ پہنچنا پڑا۔ محترمہ راضیہ بیگم

صاحبہ جوار امامؑ سے واپس ہونے پر تیار نہ ہوئیں جب کوئی عزیز ان کا اس سرزمین پر باقی نہ رہا، ایک قافلے کے ساتھ مجبوراً واپس ہوئیں۔ کراچی تک تو اس قافلے کی واپسی کا علم ہے۔ اس کے بعد خبر نہیں کہ کون کون ساتھ تھا؟ شاید جہاز پر موت آئی یا کراچی پہنچنے پر وفات ہوئی اور کچھ معلوم نہ ہوا کہ کہاں اور کب سپرد خاک ہوئیں، آج ہم اپنے نواسے سے امریکہ فون پر باتیں کرتے ہیں، اس وقت کراچی کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ مرنے والی کی والدہ معظّمہ یعنی میری دادی گریہ و ماتم کے لئے زندہ تھیں۔ خیال تھا کہ موسیٰ لین کے قبرستان (ایرانی) میں سپرد خاک ہوئی ہوں گی جہاں اب اولاد غفران مآبؒ کی بحیثیت وطن ثانی قبریں بنانا شروع ہوئی ہیں۔ (یاد رہے ہم ماضی پر قلم اٹھا رہے ہیں عصر حال کا ذکر نہیں ہے) یہ حادثہ ماہ ذی الحجہ کا والد ماجد مرحوم نے اپنی بڑی بہن کی مجلس فاتحہ خوانی آخری ذی الحجہ میں کی تھی۔ اس مجلس ایصال ثواب کا رقعہ مدرسہ سلطان المدارس کے فاضل متعلم مولانا شاہ غلام حیدر (بہار) نے مسودہ کیا۔ جو فارسی کے ماہر تھے اور میرے بڑے بھائی کے ساتھ ہی پڑھے تھے۔ اس عبارت میں 'صفیۂ من' تھی جس کو والد ماجد نے قلم زد کر دیا تھا اور شبہ یہ تھا کہ خیبر کی صفیہ کا بھائی مرحب تھا۔ رقعہ ذوائب میں جلد اول موجود ہے۔

بمبئی

عروس البلاد ہندوستان کا سب سے بڑا شہر بمبئی جہاں کئی بار جانا ہوا اور متعدد مجلسیں مغل مسجد اور دوسرے مقامات پر پڑھیں۔ یہاں کی دوسری مسجد اکبر حسین ضریح والے کے اہتمام سے تعمیر ہوئی اور روز بروز اس کی آبادی بڑھتی گئی۔ میرے خاص دوست آغا سروش مرحوم اس کے خزانچی اور دوسرے اہل لکھنؤ بانیان سمجھے جاتے ہیں۔

میری سوانح حیات میں آپ کو بمبئی کے ہر بس اسٹیشن کے نام ملیں گے جو ایک تاریخی یادگار ہے، سفینۂ حیات جلد اول میں بمبئی کے دوستوں کے بھی نام ہیں۔ میرے اولین شاگرد

ذاکر حسین فاروقی جن کا ہاشمی مجاہد پاکستان میں دوبارہ چھپا۔ اور اب اس طبقے میں کوئی زندہ نہیں۔ اس شہر میں بھی ایک مقدس خاتون کی قبر ہے جو میرے والد کی سوتیلی بہن تھیں۔ نام نامی صغریٰ بیگم اور شوہر ان کے باقر العلوم سید محمد باقر مرحوم و مغفور مجتہد لکھنؤ نے سفر عراق کے سلسلے میں ان کی نوجوانی کی موت پر وہاں دفن کیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ میری پیدائش سے پہلے کا ذکر ہو، وہ میرے باپ اور چچا دونوں بھائیوں کی چہیتی بہن اور واقعہ کربلا کی دور افتادہ شاہزادی فاطمہ صغرا کی مصیبتوں میں کنیز تھیں۔ بھائیوں کے فراق میں تڑپتی ہوئی دنیا سے گذر گئیں۔ اولاد نہ تھی۔ ان کے کچھ حالات سوانح فردوس مکان میں چھپے ہیں اور کتاب کریم فی ترجمۃ ابراہیم میں اس سے زیادہ حالات اور مظلومیت آپ دیکھ سکتے ہیں، اس وقت کا ماحول وہ پرآشوب تھا کہ نہ تو بھائیوں کو ان کا ورثہ ملا، نہ کوئی یادگار پائی، نہ جہاں دفن ہوئیں اس قبرستان کا نام بتا سکتے ہیں۔ جناب باقر العلوم کی عراق سے واپسی پر میرے والد کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ اب قلم روکتا ہوں۔ زندہ ہوں تو انشااللہ میں وقف کی بحث میں کچھ اور کہوں گا۔ انتظار کیجئے۔ مرا گمان ہے کہ یہ خاتون مرین لائن، بمبئی کے ایرانی قبرستان میں دفن ہیں جو زیادہ تر ایرانی صاحبان کا قبرستان ہے اور میری ابتدائی عمر میں عبدالطیف اس کے نگراں تھے۔ میں محترمہ کے ایصال ثواب میں اب بھی سورۂ توحید کا تحفہ روز پیش کرتا ہوں۔

پٹنہ

پٹنہ عظیم آباد لکھنؤ سے کلکتہ جاتے ہوئے صوبہ بہار کا بہت بڑا شہر ہے جہاں کے رؤسا اور عوام ایک سے ایک بڑھ کر ادب نواز ہیں۔ آخر میں ڈپٹی احمد علی خان علیم الواعظ کے خریدار اور محب خاص اہلبیتؑ جنہوں نے میرے رسالے سید الشدا ء کی تاریخ بڑی خوبی اور مجھ سے اپنے

ذاتی خلوص کے ساتھ مرتب کی۔

مجھے پٹنہ جانے کی نوبت نہیں آئی۔ بانکے پور تک اسٹیمر میں سفر کیا تھا، بارش ہو جانے سے واپس ہوا۔ اس شہر میں لکھنؤ کے عظیم شاعر جن کی ادبی خدمات پر اہل لکھنؤ واقف ہیں، یعنی مداح اہل بیت سید اصطفیٰ خورشیدؔ دفن (ہیں) یہ میر مہدی حسین ماہرؔ صاحب دیوان کے داماد اور سید العلماء اخوی مولانا سید علی نقی صاحب سلمہٗ کے حقیقی نانا ہیں۔ مہذبؔ لکھنوی نے مجھ سے ان کا فوٹو حاصل کر کے اپنے قلمی خدمات میں پیش کیا۔ موصوف بسلسلہ ذاکری مدعو ہوئے اور پٹنہ عظیم آباد میں انتقال کیا۔

کانپور

یوپی کا وہ شہر جو (لکھنؤ سے) ۴۹ میل (تقریباً ۸۰ کلومیٹر) پر واقع ہے۔ وہ بہت بڑی تجارت گاہ اور شیعوں کا مرکز ہے۔ میں نے سب سے پہلے لکھنؤ سے نکل کر یہاں پہلا ماہ رمضان جیٹھ بیساکھ کی گرمی میں کیا اور وہاں کی خدمات میری کتابوں میں بڑی تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے اب تک وہ رابطہ قوی سے قوی ہوتا جا رہا ہے اور وہاں کی تیسری نسل میری تصانیف پر اشاعت کے ارادہ میں ہے۔ اس زمین پر صرف وہ خاتون سپرد خاک ہیں جو حضرت سید محمد کاظم جاویدؔ مرحوم کی وارث قرار پائیں اور بڑے فقر و فاقہ میں اپنے عظیم ممدوح نامی کے ساتھ رہتی تھیں۔ ممدوح نامی حضرت قدوۃ العلماء کو آقا حسن بھائی کہتے تھے۔ اس سے زیادہ کا علم نہیں۔

حیدرآباد دکن

سلطنت عثمانیاں کے پایۂ تخت حیدرآباد میں میرے خاندان کے حکیم سید علی صاحب آشفتہؔ دفن ہیں جو طبابت میں اچھی خاصی شہرت رکھتے تھے۔ لکھنؤ سے طبی کمالات حاصل کر کے

دہلی گئے اور حکیم اجمل خاں صاحب سے شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ ملحوظ خاطر رہے کہ لکھنؤ کے حکماء مفردات سے علاج کرتے اور کشتہ سے ان کے علاج کا طرز نہ تھا۔ کبھی کسی خاص مجبوری میں کشتہ دیتے۔ آشفتہؔ صاحب مرحوم نے دہلی سے واپس آکر اپنے دوا خانے کا نام 'کیمیائے اودھ' رکھا۔ ان کو نوجوانی میں کشتی سے شوق تھا، طاقتور جوان تھے۔ ابتدائے زندگی میں اس وقت کے (ہندوستانی انگریزوں کے وفادار رعایا تھے) یورپ کی پہلی جنگ عظیم جب شہر سے پہلا روز نامہ ''سیارہ'' جاری ہوا اور شبیر حسن قتیلؔ نے اپنی ادارت میں زیادہ سے زیادہ روز نامہ کو شہرت دی، اس وقت آشفتہؔ مرحوم کی ایک نظم میرے خاندان کے بچوں میں جو آج بڑھے اور بڑے نامور عالم دین سید العلماء علی نقی نامی ہیں، ان کا بچپنا تھا اور اپنی غیر معمولی ذہانت میں یہ نظم یاد کر لی۔ وہ میرے اور ان کے دونوں کے رشتے میں چچا تھے۔ نظم کا مطلع اس وقت یاد آ گیا ہے:

دل کی لگی کو قیصر جرمن بجھا چکا
برطانیہ کے شیر سے آنکھیں لڑا چکا

اسی منظومہ کا ایک مصرعہ یہ بھی تھا:

کیا کر سکے گا تو میرے برٹش کے راج کا

یہ تھے آشفتہؔ کے جوانی میں افکار، پنجاب سے واپس ہو کر وہ پکے کانگریسی ہو گئے۔ 'تاریخ لکھنؤ' کے دیباچہ میں ان کی خدمات کا اشارہ میرے قلم سے ہو چکا ہے۔ آشفتہؔ مرحوم سے میری آخری سفر حیدر آباد دکن میں ملاقات ہوئی۔ وہ عیال کے ساتھ دکن میں تھے اور اسی سر زمین پر ان کا انتقال ہوا،

جرول ضلع بہرائچ

سادات کی مشہور بستی اور چھوٹی لائن پر وہ آبادی ہے، جہاں اکثر صاحبانِ کمال گزرے، شعر وسخن اور علم وادب کے نمایاں گھر، تالیفات کی مشہور کتابیں، اس دیہات کی یادگار ہیں اور ناظرین کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ عراق میں برسہابرس قیام کرنے اور دینی خدمات انجام دینے والے بزرگ جو اخلاف غفران مآبؒ کے ایک مشہور فرد مولانا سید کلب باقر صاحب مرحوم تھے۔ ان کا ۱۳۲۷ھ کے حدود میں اس مقدس زمین پر قیام رہا۔ طلباء کو وظیفے، ہندی زائروں کی خدمت اور ان کے تعاون میں وہ محتاج تعریف نہ تھے۔ انگریزی سفارت خانہ ان کی بڑی عزت کرتا۔ اپنے دوران خدمت میں ہندوستان آئے اور رحلت فرما کر جرول میں دفن ہوئے، یہ قبر وہاں نمایاں طور پر موجود ہے، میرے محترم مولوی الحاج سید مسلم مہدی صاحب پیش نماز و خطیب کراچی نے بتایا، جس کا میں شکر گزار ہوں۔

نصیر آباد ضلع رائے بریلی

مولوی سید محمد ہاشم صاحب مرحوم میرے خاندان کے جلیل فرد، جو پیش نماز اور ذاکر حسینؑ تھے، جس وقت لکھنؤ میں شیعہ کانفرنس کی بنیاد صدر الصدور کے نام سے قائم ہوئی تھی، اس وقت آپ کا قیام مسجد تحسین علی خان پر تھا اور آپ نے اردو زبان میں ایک تخریج الآیات مرتب کیا تھا جو ان کے ذہن کی کاوش کا شاہکار تھا چھپ نہیں سکا، ان کی عمر وطن میں ختم ہوئی اور ان کی اولاد اور قبر نصیر آباد میں موجود ہے۔ میں نے ان کی تقریریں محلے کی قومی انجمن میں سنیں۔ خط ان کا بہت اچھا تھا۔ اور ایک نقشہ دکانات مسجد تحسین علی خان کا رنگین میرے پاس مدتوں باقی رہا۔

جلالی، ضلع علی گڑھ

یوپی کے شیعہ علاقے میں یہ مقام کافی مشہور ہے جہاں کی قومی خدمات شیعہ کانفرنس اور

شیعہ کالج کے حالات میں آجاتے ہیں۔ میرے حالات زندگی میں جلالی کے سفر کا ذکر ہے وہاں اولاد غفران مآبؒ مولوی سید حامد حسن صاحب مرد مقدس بسلسلۂ پیش نمازی آخر تک قیام پذیر رہے۔ ان کے بھائیوں میں مولانا سید زاہد حسن صاحب مرحوم اور سید جعفر حسن صاحب لکھنؤ میں رہے۔ مولوی حامد حسن صاحب کے صاحبزادے قمر العلماء ساجد حسن مرحوم مولوی سید علی باقر صاحب کے ساتھ ہی عراق سے پڑھ کر آئے تھے۔ یہ ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے لکھنؤ اور جلالی کے قیام میں دماغی امراض میں مبتلا ہوئے اور جلالی میں انتقال کیا۔

بلرام پور

چھوٹی لائن پر مشہور ہندو ریاست جس کے کرتا دھرتا حیدر کرّار، جعفر طیار مشہور شیعہ خاندان کے افراد تھے، جن کو قومیات سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان حضرات کی آبادی میں نماز پڑھانے کے لئے غفران مآبؒ کے ایک پوتے مولوی سید عابد علی صاحب مرد مقدس تھے جو میرا خیال ہے کہ مدت تک بلرام پور میں رہے۔

وہ جناب سید بچھن صاحب قبلہ مجتہد مرحوم وفات ۱۳۰۸ھ (تخمیناً)، کے چھوٹے بیٹے تھے اور میرے حقیقی چچا مولانا سید ابوالحسن صاحب قبلہ سابق پرنسپل مدرسۃ الواعظین کے ابتدائی شاگردوں میں تھے، خاندانی جلالت کے لحاظ سے ان کا درس چھپ کر ہوتا تھا، جس میں مصلحت یہ تھی کہ درسیات میں چھوٹی کتابیں پڑھنا ان کے شایان شان نہ تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب میں شرائع الاسلام عمو موصوف سے پڑھتا تھا، وہ مجھ سے کافی بڑے تھے اور بڑے خوش اخلاق تھے، اس وقت تک بلرام پور کا رابطہ نہ تھا۔ ریاست مذکورہ کے قیام میں کافی ہر دلعزیز رہے اور میرے دوست ہم عصر مولانا لقا علی صاحب حیدری بدایونی مدرسۃ الواعظین

نے اپنی چھپی ہوئی کتاب میں ان کا ذکرِ خیر کیا ہے، تازہ خبر یہ ہے کہ موصوف بلرام پور جانے سے پہلے مدرسۂ ناظمیہ کے ابتدائی مدرس تھے اوران کے مکتب سے تعلیم حاصل کئے ہوئے کتنے افراد ہوں گے جن میں حسب ذیل نام حاصل ہوئے ہیں:

(۱) فخر خاندان انیسؔ سید اصغر حسین صاحب شائقؔ جو براہ راست اس خاندان کے جانشین اور خاندانی تبرکات کے واحد مالک ہیں۔ یادگار انیسؔ کے جلسوں نے اگر موصوف کو ذاتی مکان کی پیش کش سے مدد پہنچائی ہوتی تو بہترین یادگار انیسؔ ہوتی۔ وہ اس وقت قابل عزت درجہ پر ہے۔

(۲) مولوی سید محمد ہادی فقیہ مرحوم میرے بڑے بیٹے بھی مرحوم کے ابتدائی شاگردوں میں تھے جن کی مختصر زندگی قوم سے چھپی نہیں ہے، شیر خوارگی کی عمر میں نویں محرم کی مجلس تھی جس میں قمع کا ماتم تھا اور سر میں تلوار لگائی بغیر کسی علاج کے زخم بھرا۔ اس قربانی کے تذکرے اس وقت کے سامعین آج تک کرتے ہیں۔

دلدوز واقعہ یادرکھا وہ ہندوستان کی تعلیم سے فارغ ہوکر نجف اشرف میں تحصیل علم کے بعد دارالعلوم قم سے مشرف ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ آج جو روز عاشور کے جلوس میں شارع عام پر نماز ظہرین ہوتی ہے، وہ سب سے پہلے ان کی اقتدا میں ہوئی اور وہ تھے جس نے ۲۱ ر رمضان نشتر پارک کے یوم غم میں ایک خطیب سے مجلس میں کھڑے ہوکر اختلاف کیا۔ حاضرین نے صبر وسکون سے ان کا یہ علمی عذر دیکھا۔

دوسرے روز حضرت علامہ رشید ترابی مرحوم ومغفور نے گھر پر تشریف لاکر اس اقدام کو سراہا اور موصوف کی ہمت افزائی کی۔ انہوں نے کراچی پہنچ کر اپنی ابتداء میں آگ پر ماتم کیا۔ علم فقہ میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ یہی یادگار ہے جسے چھوڑ کر شباب میں داغ مفارقت دے گئے۔

یہ تھے میرے خیالات جن کو یکجا کرنے میں خداوند عالم نے کامیاب کیا اور اب غفران مآبؒ کے تیسرے ایڈیشن میں حاضر ہیں۔ دوسرے باخبر اہل خاندان کو اپنی معلومات سے اضافہ کا حق ہے۔رائے بریلی قبرستان کونڈری میں ایک بچہ میرا ابھی دفن ہے جس کو یاد کر کے طول کلام سے قلم روکتا ہوں۔ یہ تھے تقسیم ہند سے پہلے کے واقعات، اب خبر نہیں کہ اولاد غفران مآب کہاں کہاں ہے، اس کی تشریح کر چکا ہوں خداوند عالم ان سب کو علم و عمل کی توفیق دے اور امام زین العابدینؑ کی دعائے صحیفہ کاملہ میں یہ تمنا ہے کہ جو مرکز سے ہجرت کر گئے ہیں وہ واپس آ جائیں یہی تمنا میری بھی ہے۔

امروہہ ضلع مراد آباد

سادات امروہہ میں میرے محترم دوست سید تفضّل حسین نقوی جن سے لکھنؤ کے قیام میں شناسائی اور پاکستان پہنچنے پر روابط بڑھتے گئے۔آخر میں وہ حیدرآباد (سندھ) چلے گئے اور حاجی غلام علی اور حاجی جعفر علی مرحوم (خوجہ جماعت) ان کے میزبان ہوتے لیکن عشرہ محرم وہ خالق دینا ہال کی نماز مغربین میں بڑی دلچسپی سے شرکت کرتے۔اس وقت ان کا عارضی قیام اردو بازار کراچی میں ہوتا۔ موصوف نے ایک بار مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک قبر آپ کے سلسلۂ اجداد میں امروہہ میں بھی ہے۔اس وقت اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔اب کوشش میں ہوں کہ وہ نام بھی محفوظ ہو جائے۔

اسی مقدس سرزمین پر مشہور فلسفی مولانا سید محمد رضا صاحب شمس پوری مدرس معقولات جامعہ سلطانیہ بھی سپرد خاک ہیں۔ان کے وقت انتقال میں لکھنؤ میں موجود نہیں تھا۔وطن پہنچ کر صرف اتنا معلوم کر سکا کہ وقت غسل دانتوں کا چوکا نکل نہیں سکا اور مصنوعی دندان سمیت آپ

دفن ہوئے۔ ہندوستان میں سلطان المدارس کا فارغ التحصیل ہر شخص ان کا شاگرد ہے، اولا دان کی رضویہ سوسائٹی کراچی میں موجود ہے۔ خاتمۂ تحریر میں ایک اور قبر کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو ہمارے مایۂ ناز کاتب مرزا محمد جواد صاحب آہنی پھاٹک لکھنؤ کی ہے۔ یہ وہ نسّاخ ہیں جن کی ترقی کا اثاث مولانا فرمان علی صاحب مرحوم کے ترجمۂ قرآن کی اشاعت ہے اور سب سے بڑا شرف ان کو خدا نے یہ دیا کہ راجہ صاحب محمود آباد کے اہتمام سے عراق روانہ ہوئے اور حرم امام مظلومؑ میں در و دیوار پر ان کی کتابت کے نقوش درج کئے گئے۔ یہ وہ شرف ہے جو کسی ہندوستانی کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ موصوف کی والدہ بھی اسی امام باڑے میں دفن ہیں۔

معذرت

تاریخ لکھنؤ میں حضرت مولانا ملا علی اصغر صاحب پروفیسر کیننگ کالج کی قبر امام باڑہ غفران مآبؒ میں جو بتا چکا ہوں، وہ خبر صحیح نہ تھی۔ مولانا مرحوم قبرستان کھجوا میں سپرد خاک ہوئے ہیں اور مملکت غیر میں یہ عقد قاسمؑ کا محققانہ ترجمان زیر زمین ہے۔ میری اس اطلاع کو بالکل صحیح سمجھئے اور دوسری لغزش میرے قلم کی اطلاعات میں یہ ہوئی کہ تحسین علی خاں کی مہر جو آثار قدیمہ میں میرے پاس موجود ہے، وہ بڑے تحسین نہ تھے بلکہ تحسین علی خان خرد کی مُہر ہے جن کی مقبول عام مسجد باورچی ٹولے میں موجود ہے، صاحبان عقیدت اپنی مہر کو وقت انتقال یا ان کے ورثاء ہمارے سپرد اس لئے کرتے تھے کہ ان کا کوئی دشمن مہر کر کے جعلی تحریر نہ بنا لے۔ میرے عصر کے قابل شاعر اور خاندانی فرد حضرت فہیم لکھنوی کے وقت انتقال میں بھوپال میں تھا اور شریک دفن نہ تھا، اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ان کی قبر کہاں ہے؟ ان کی روحانیت پر میرا خواب دلیل ہے کہ میں نے وزیر ریاست بھوپال کی میزبانی میں شب کو ایک غمناک خواب دیکھا اور

صبح کو میں وہاں سے چل پڑا۔ گھر پہنچ کر علم ہوا کہ فہیمؔ چچا نے رحلت کی، یہ وہی بزرگ ہیں جن کے نوجوان بیٹے نے خودکشی کی اور ایک عبرتناک موت سے آوارہ ساتھیوں کی بدولت دوچار ہوئے۔ فہیمؔ کا کلام لکھنؤ میں ہونا چاہیئے۔

ہاں خوب یاد آیا حضرت ماہرؔ لکھنوی کے بھائی مولوی سید صادق حسین عقیلؔ لکھنوی کی قبر بھی امام باڑے میں ہے، ان کا انتقال میرے ہوش سے پہلے ہوا اور یہ قبر اگر میرے علم میں ہوتی اور مجھے بحیثیت وارث اختیار ہوتا تو یقیناً ۳۰/ برس کے بعد قبر کھود کر ٹین کا وہ صندوقچہ نکال لیتا جو مرثیوں سے بھرا ہوا وہ اپنی قبر میں لے گئے۔ عمر بھر کے کلام کا قبر میں لے جانا اس لئے تھا کہ حقیقی بھائی مہدی حسین ماہرؔ کے فروغ میں ان کے کلام کو عوام کیا سنتے اور ان کا کلام بہتر تھا کہ جس کی مدح میں کہا گیا ہے صرف اسی سے داد لی جائے۔ حضرت عقیلؔ کی تصویر بھی میرے البم میں موجود ہے اور جناب مفتی میر عباس صاحب قبلہ (وفات ۲۵/ رجب ۱۳۰۶ھ) وہ اسی امام باڑے میں ہیں۔

انقلاب وقت اور جائداد علمائے خاندان غفران مآب کا حشر

یہ بحث اس لحاظ سے بڑی رنج وصدمہ سے سنی جائے گی کہ جس طرح سلطنت اودھ کا عطیہ مواضعات باقی نہ رہے اور عدالت کے فیصلے میں میراث قرار پائے اور غفران مآبؒ کا کتب خانہ ان کے احفاد (پوتے) میں علم نہ رہا تو کبھی اولاد دختری کے قبضے میں اور کبھی مقدمات کے چلنے پر ورثہ کی رسہ کشی میں رفتہ رفتہ فنا ہوا جس کے اشارے میرے قلم سے ہو چکے ہیں، پہلا مقدمہ انگریزی حکومت کے دور میں عہد سلطان العلماء میں چلا اس کے بعد مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ اور مولوی جعفن صاحب مرحوم میں کئی سال تک دائر رہا، اس کے بعد جائداد غفران مآبؒ کے مالک سید دلدار علی عرف منے آغا صاحب راز اجتہادی قرار پائے۔

سابق بیان میں گذرا ان کے بڑے بھائی مولوی سید محمد عرف آغا صاحب تحصیل علم میں عراق میں فوت ہو گئے۔ رازؔ اجتہادی آبائی منصب پر نہ تھے اور وہ خود بھی اس جلیل نسبت کے قابل اپنی ذات نہ سمجھتے تھے۔ ان کے ادبیات میں رازؔ بلگرامی ان کی دستخط تھی۔ اور وہ اپنے ننہیال کی طرف نسبت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ تھیں وہ وجوہات جس سے علمی وقار عام نگاہوں میں اس گھرانے کے بھانجے شمس العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب مجتہد مرحوم کو حاصل ہوا اور وہ جناب اپنی تکمیل علم کے بعد ریاست محمود آباد ضلع سیتاپور کی دینی خدمات اور انتظامات ریاست کے تاحیات اعلیٰ نگراں رہے۔............اب رہے غفران مآبؒ کے چھوٹے بیٹے علیین مکان کی نسل کے چشم و چراغ ممتاز العلماء فخر المدرسین جنت مآب سید تقی صاحب قبلہ ان کا امام باڑہ اور کتب خانہ بھی اپنے جد کے دوش بدوش شہرت اور خصوصیات کا حامل رہا اور ان کا امام باڑہ مجلسوں کی مقبولیت، عمارت کی بزرگی کے لحاظ سے امام باڑہ آصف الدولہ کے بعد سب سے بڑا امام باڑہ قرار پایا۔

یہ جائداد بھی تیسری پشت میں مقدمہ بازی کی بلا میں گرفتار ہوئی۔ 'جمیعت خدام عزا' کے نشریہ ''تذکرۃ المتقین'' میں ماسٹر سید آفتاب حسین کاظمی سہارنپوری نے بڑی تشریح کے ساتھ میرے والد مرحوم کے حالات پر قلم اٹھایا ہے اور جناب کو پوری زندگی بحیثیت مدعا علیہ مصائب کا سامنا رہا۔ ان مشکلات کا آغاز کتب خانہ کے داروغہ میر یاد علی کو ان کے عہدے سے ہٹا دینے پر ہوا۔ یاد علی مرحوم اپنے وقت کے میر جعفر بنگال سے کم نہ تھے، ان کی مخالفت میں تخم ریزی اور کچھ خاندانی دشمنوں کی آبیاری کبھی تو جناب ممتاز العلماء کے مقدس نواسے کو مدعی قرار دے کر ہوئی، کبھی ان کے سوتیلے بھائیوں کو برسر پیکار کیا۔ کوئی طاقت میرے والد ماجد کو شکست نہ دے سکی اور ہر مقدمہ مصالحت پر ختم ہوا۔ یہاں تک کہ دیرینہ شکست پہ شکست نے گورنمٹ کو

مدعی بنانے کی آخری صورت اختیار کی۔

یہ تمام واقعات ''اِحۡیَاءُ الۡآثَارِ''میں موجود اور کاظمی صاحب سہار نپوری بڑی جرأت مندی سے قلم اٹھا چکے ہیں جو چھپے ہوئے صفحات آج بھی موجود ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شیعہ کالج لکھنؤ میں قائم ہونے کی تحریک شروع ہے۔ سر فتح علی خان مرحوم جنرل سکریٹری اور نواب مولوی سید مہدی حسن صاحب جوائنٹ سکریٹری اور ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر عبدالغنی پنجابی برسرحکومت ہیں۔ چند قانونی نقائص میں یہ دعویٰ اس سے پہلے ڈسمس ہو چکا تھا، اس مرتبہ دفعہ نمبر ۹۲۰ر کا سہارا لے کر پوری طاقت سے حملہ ہوا اور ماہ رمضان کے مقدس مہینے میں والد مرحوم کے بیانات ان کی شہادت پر جرح اور ماحول کے سازگار ہونے پر دشمن کامیاب ہوئے اور مختصر یہ ہے کہ جوڈیشنل کمشنر کی عدالت میں اپیل بھی ایسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میں رد ہوئی جس کا کبھی تصور نہ تھا اور شہنشاہ حسین وکیل نے امام باڑہ ممتاز العلماء کے وقف عام ہونے پر وہ مضحکہ خیز ثبوت دیئے اور عدالت کو سمجھانے میں وہ کامیابی حاصل کی جس پر پورا شہر کف افسوس مل رہا تھا۔ نتیجہ میں عدالت عالیہ سے ماتحت کا فیصلہ بحال رہا، اللہ کی قدرت تھی نہ تو شہادت میں والد مرحوم کے اختلاف بیان سے کوئی معقول ثبوت ہاتھ آیا نہ موصوف نے جو حسابات پیش کئے تھے اس میں کوئی خامی دکھائی جاسکی ورنہ حساب فہمی آخری حملہ ہوسکتا تھا۔ اس طویل مدت میں صرف قوم ہی نہیں بلکہ دعوے دار اپنے کردار اور دھاندلی پر پشیمان ہوئے۔

مرحوم کی شخصیت سے وہ ہمہ گیر محبت ہر شخص کو پیدا ہوئی جو عدالت کے نئے انتظام میں، نہ تو مجلسیں کرسکیں نہ دیگر خدمات۔ وقف ہوتے رہے قوم نے پوری طاقت سے ان شہرہ آفاق مجلسوں کو اپنے انتظام سے شہر کے بہت بڑے شاہی مکان میں منتقل کیا اور مجلسیں انجمن اصلاح المومنین نے قائم کر کے اپنے ہاتھ میں لیں۔ ادھر میرے والد ماجد یعنی مولانا محمد تقی صاحب قبلہ

نے پری کونسل لندن میں اپیل کی اور اس دھاندلی کا شہر کے ممتاز ترین مشیر قانونی باس دیولال ایڈوکیٹ نے وجوہات اپیل لکھے۔ مقدمہ دائر ہوا۔ مسل مقدمہ چھپنے کے لئے لندن عدالت میں تیار ہونا شروع ہوئی، اس عرصے میں تین برس گزرے، کمیٹی وقف نہ مجلسیں کر سکی، نہ کارکنان وقف کو قوم کی ہمدردی حاصل ہوئی۔ میں آزادی کے ساتھ لکھنے پر تیار ہوں کہ مخالف جماعت صرف بغاوت میں دیہاتی داروغہ کے غم وغصہ کا شکار ہوئی۔ اس کو نہ ہم سے دیرینہ مخالفت تھی نہ وہ کینہ پرور تھا۔

اس طبقے میں صحیح قومی خدمت کرنے والے بھی تھے۔ جو اپنے کردار پر پشیمانی اور بات نبھار ہے تھے۔ والد مرحوم نے اس موقع پر پہلا محرم لکھنؤ چھوڑ کر ریاست گوالیار میں کیا، دوسرا محرم ان کو بمبئی میں ہوا، تیسرا محرم ان کی زندگی کا آخری سال تھا، اس برس بقرعید کی تئیس کو مجھے سخت ترین بخار آیا جو تیرہ دن تک نہ اترا۔ والد مرحوم میری تیمارداری میں مصروف ہوئے۔ یہ بھی واضح کردوں کہ میرے بڑے بھائی اس مقدمے کے خلاف فیصل ہونے پر عراق چلے گئے اور اپنی تکمیل میں نجف اشرف کی مقدس زمین پر مصروف ہیں۔ اس عالم تنہائی میں جناب والا مرحوم تیسری بار لکھنؤ کہاں چھوڑ سکتے تھے۔

محرم کا چاند قریب ہوتے ہوئے ان کے راحت وآرام نے ساتھ چھوڑا، چاندرات سے پہلے معمولی بخار آیا مگر میری تیمارداری میں کوئی کمی نہیں کی، دفعتاً بخار تیز ہوا، شب کو اپنی خواب گاہ کا وہ دروازہ جو امام باڑہ کی طرف تھا حسینیؑ بارگاہ کی آخری زیارت کی، دروازے عزاخانے کے بند تھے، آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ احتجاج میں مجلسیں دوسری جگہ منتقل ہو چکی ہیں۔ صحن امام باڑہ کو سنسان دیکھ کر بے ساختہ زمین پر گرے اور اس صدمے سے جسم ٹھنڈا ہوا، سخت حملہ تھا کہ

پانچویں محرم روز وفات تک پھر جسم میں حرارت پیدا نہ ہوئی) یونانی اور ڈاکٹری ماہر معالج تدارک میں کامیاب نہ ہوئے۔ چوتھی محرم گزر کر پانچواں دن شروع ہونے سے پہلے ہمیشہ کے لئے دنیا چھوڑ دی اور اسی شب مرا بخار بھی تیرہ دن کے بعد اترا۔ صبح سے پہلے شہر میں انتقال کی خبر گشت کر چکی تھی، امام باڑہ غفران مآبؒ میں دفن کی وصیت تھی تاکہ اپنے امام باڑہ کو ترک کرنے میں قانونی سقم پیدا نہ ہو۔ ناظرین آپ کو قوم کی ہمدردی کا حال معلوم ہو چکا ہے میرا جو حال ہے وہ بھی واضح ہے، جنازہ کے ساتھ زیادہ چل نہیں سکتا، آخری شب کی خدمت چچا جان مرحوم ومغفور نے پورے انہماک سے انجام دی۔ آشفتہ صاحب مرحوم اور دیگر اہل خاندان کا تعاون قابل ذکر ہے، مجھ کو وفات کے وقت بھی دوسرے مکان میں پہنچنے پر مجبور کیا بلکہ دیدار آخر بھی میں نہ کر سکا۔ آخری تعمیل حکم اپنے بزرگوں کی مجھ سے یہ ہوئی کہ نماز جنازہ کے بعد مجھ کو اس خطرے میں کہ کمزور بہت ہوں شریک دفن بھی ہونے نہ دیا۔

اہم ترین مشکل

قدرت کا یہ عظیم احسان تھا کہ ایسے سخت وقت میں عقل سالم رہی اور ایک بڑی سیاسی غلطی سے خدا نے بچایا اور وہ یہ ہے کہ مقدمہ وقف کا بانی طبقہ اپنے کردار سے اتنا شرمندہ تھا کہ نہ تو اس کو مشایعت جنازہ میں آنے کی ہمت ہوئی، نہ فاتحۂ سوم وچہلم میں تعزیت مناسب ہوئی۔ اس طبقے کے روح رواں نواب مرتضیٰ حسین خان ٹرسٹی وقف حسین آباد مبارک نے غسل خانہ کی تنگ گلی میں میری فینس (پالکی) روک کر تعزیت کی اور رومال میں ایک معقول رقم پیش کی۔ خود والد ماجد کا مقولہ تھا کہ انسان کی آنکھ سے آنسو اسی وقت نکلتا ہے جب وہ صحیح ہمدردی کرے۔ میں نے اس اچانک تعاون کو جناب مرحوم کی مظلومیت کا عملی ثبوت اور ان کی حقیقت کی فتح قرار

دے کر قبول کیا وہ راستے ہی سے گھر واپس ہوئے اور مجھے نہیں اندازہ کہ یہ اطلاع قوم کے کان تک کس نے پہنچائی، سوم کی مجلس مولانا لقا علی صاحب حیدری کی پیش خوانی اور چچا جان کی قیامت خیز خطابت پر ختم ہوئی اور اسی ہفتے میں میرے لئے زندگی کی پہلی بدنامی کا سامنا ہوا، عزیز و اقارب و دوست ہر شخص کو شکوہ تھا کہ میں نے باپ کے مخالفوں سے امداد حاصل کی، یہ شکوہ میری نگاہ میں ایک ناپائدار الزام اور واقعات سے بے خبر ہونے کا نتیجہ تھا اور مجھے قوی امید تھی کہ میرے ذمہ دار مشورہ دینے والے اس الزام کو واپس لے کر میری فراست پر داد دیں گے، چنانچہ اسی ہجوم مخالفت میں مجھے انجمن اصلاح المومنین کی منعقد کردہ مجلس فاتحہ خوانی میں شرکت کی نوبت نہیں آئی جو یقیناً میرا دوسرا گناہ ہوتا، لیکن شہر اور بیرونجات کے پیغامات تعزیت اور امور خانہ انجام دینے والا میرے سوا کوئی نہ تھا، اس لئے مجھے بھرپور امید تھی کہ میرے دوست اپنے الزام کو واپس لے کر عقل کا ثبوت دیں گے۔ پہلا سبق تو یہ تھا کہ اس تعزیت کی رقم کو حاصل کرنے سے مخالف کی پشیمانی باقی رہی اور فی الحقیقت جو ہدیہ اس کا دل سے تھا، اس کو رد کرنے (کرنا)، مخالفت کو بڑھانا دانشمندی نہ تھی۔ امام زین العابدین علیہ السلام دعائے توبہ میں خجالت اور ندامت کو توبہ کے مرادف قرار دیتے ہیں۔ اس لئے اس موقع کو ہاتھ سے دینا برا تھا، دوسرے بھائی صاحب قبلہ کے عراق سے واپس ہونے پر والد ماجد کی موروثی جگہ پر تقرر انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھا جو ہمدردی میں آج پہلی مرتبہ مجھ سے ملے ہیں۔

حسین آباد ٹرسٹ میں والد کی قائم مقامی پر اولاد کا انتخاب اس وقت کی ہمدردی کا ایک حصہ ہے جو آج خدا نے میرے ہاتھ سے قائم کیا۔ چنانچہ میری جماعت کے سربراہ انسان محمد ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ اور دوسرے صاحبان اثر نے قبول کیا اور خدا کی حمد ہے کہ میں اس عہدے پر انہیں ٹرسٹی نواب مرتضیٰ حسین خان آفریدی مجسٹریٹ و متولی دوم وقف کی تجویز پر (میں) بلا اختلاف کامیاب ہوا، اگرچہ والد مرحوم نے اس عہدے کے لئے مجھے نامزد کیا تھا

مگر بھائی صاحب کے عراق سے آنے پر خدمات ان کو تفویض کر دیئے اور آخر تک وہ عہدے پر باقی رہے اور عراق سے واپس ہونے ہی کے بعد وقف کی کمیٹی میں ممبر قرار پائے، اب پریوی کونسل کی اپیل کرنے والا کون تھا اور شخصی حکومت کو کمیٹی توڑ کر کون لائے گا، انتظام کون کر سکتا تھا، مگر اب بھی وقف کے خلاف جو عنصر قائم ہو گیا تھا وہ باقی رہا۔

میری دوسری مشکل

یہ مصیبت پہلی سختی سے بھی زیادہ تباہ کن تھی کہ جناب عمو معظم مولانا سید ابوالحسن صاحب قبلہ مجتہد اور واقف کی اولاد میں عالم کمیٹی کی تشکیل کو میری نظر سے دیکھتے ہوئے مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ تمہاری طرف سے اب استحقاق حق کا دعویٰ ہو اور میں اپنے حقوق عا لمیت تم کو سپرد کردوں۔ میں نے بے شک والد ماجد کے بعد جو کچھ پڑھا وہ موصوف سے پڑھا اور مدرسۃ الواعظین کی 'الواعظ' میں ادارت ورابطہ تھا کہ اس درس گاہ کی عمارت میں رہ کر علمی فیوض حاصل کرنے میں سلسلہ قطع نہ ہو کر قدرت نے ان کی قیام گاہ کو سخت بارش میں چھوڑنے پر مجبور کیا اور میرے کرائے کے مکان سے متصل وہ تشریف لائے اور صبح وفات تک حاضر خدمت رہا، اور ان کے آخری کاغذات کی حفاظت کی۔ ان شفقتوں میں میری جرأت نہ تھی کہ نہیں کروں لیکن خدمت عالی میں عرض کیا، آپ کو خوب علم ہے کہ والد صاحب نے جو نقد روپیہ دادا صاحب کی میراث میں آیا تھا وہ اور ان کی تمام جائداد منقولہ وغیر منقولہ مقدمات وقف کی پیروی میں ختم ہوئی، جو دو مکان والد صاحب نے چھوڑے ہیں وہ رہن شدہ قرض کے بار سے عنقریب قبضے سے نکل رہے ہیں اور سکونتی مکان کی بھی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

اب مقدمے کی پیروی کس سرمایہ سے ہوگی، بیشک اس وقت ہماری حقیقت کا زمانہ نے اعتراف کرلیا ہے۔ اور دور استبداد ختم ہو گیا، جو تخریب کرنے والے تھے وہ اپنی غلط فہمی پر نادم

اور دنیا ہمارے ساتھ ہوگئی، مگر اس حق کے عدالت سے طلب کرنے میں ہم علمی خدمات سے رک جائیں گے اور ذات کے فروغ میں یہ چندروزہ دنیا گزر کر مقصد تبلیغ ختم ہوجائے گا اور سارا وقت قوم کے سامنے چندہ کے لئے ہاتھ پھیلانے میں گزرے گا۔ یہ ذلت میرے بس کی بات نہیں اور موجودہ حلقہ اثر میں کوئی ایسا نہیں جو مقدمہ کے اخراجات برداشت کرے۔ والد ماجد نے اپنی جان و مال وقف کی حفاظت میں صرف کر کے خدا کے یہاں جو درجہ پایا وہ امکانات اب میرے سامنے نہیں ہیں مجھے اس مصروفیت سے باز رکھئے۔ جناب نے میری معذوری تسلیم کی اور آخری وقت تک اپنی شفقت کو باقی رکھا۔ ان کی بھی وصیت تھی کہ احتجاج میں امام باڑہ میں دفن نہ ہوں۔ میں نے پیش آنے والے ان حالات کو یاد دلا کر جو والد ماجد کی قبر امام باڑہ غفران مآبؒ میں بنوانے پر پیش آئے، اور ان کی قبر شریف زمین امام باڑہ سے دور ہونے پر منہدم ہو کر بارش کے سیلاب میں بے نشان ہوئی، اس لئے میری تجویز یہ ہوئی کہ جناب چچا صاحب مرحوم خود اپنی اس آراضی پر دفن ہوں جو مسجد باغ کے صحن سے متصل اور امام باڑہ کے حدود سے باہر ہے میری ذات اس وقت اس درجہ پر تھی کہ محترمہ چچی صاحبہ اور مرحوم کے نصیر آبادی اولاد کم سن تھے۔ میری تجویز باتفاق آراء منظور ہوئی اور پھر جناب کے خیالات کے تحفظ میں چچی صاحبہ بھی اسی زمین پر دفن ہوئیں۔

اطلاع

غفران مآبؒ کی شخصیت پر میرے ابتدائی دور میں ''معراج العقولؑ'' کے عربی دان مصنف نے بار بار علمی شبہات پیش کر کے ان کی رد کی ہے جو ''دعائے مشلول'' کی بلند پایہ شرح ہے۔ اس کو راجہ ابوجعفر مرحوم تعلقہ دار پیر پور نے آرٹ پیپر پر شائع کی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بڑی ہستیوں پر انسان قلم اٹھا کر شہرت چاہتا ہے یا کبھی کسی کو ان کی تحقیق سے صدمہ پہنچنے

پر انتقام لیتا ہے۔ شارح دعائے مذکور کی بالکل یہی حیثیت تھی۔ علمی حلقوں میں اس اقدام سے بچینی پھیلی اور خود چچا جان مرحوم و مغفور نے قلم اٹھایا اور بھائی صاحب مرحوم کی طالب علمی تھی۔ ان کی طرف سے دندان شکن جوابات دیئے اور یہ علماء کا دستور ہے کہ جب وہ مخاطب کو اپنے برابر والا نہیں سمجھتے تو اپنے کسی شاگرد یا بیٹے بھتیجے کی طرف سے کتاب لکھتے ہیں:

اعتراضات فلسفہ اور منطق کے پیرائے میں تھے تو جناب نے ویسے ہی لب و لہجہ میں جوابات دیئے۔ افسوس ہے کہ اس وقت مولانا سید کاظم حسین صاحب انتقال کر چکے ورنہ وہ فلسفہ و حکمت کے آخری ماہر خاندان میں گذرے ہیں، اس وقت کے دیگر اہل علم میں چچا صاحب قبلہ کی صحبت کے اہل علم اس کتاب کو سنتے اور داد دیتے۔ مرزا محمد حیدر صاحب مرحوم جو مولوی شاہ محمد مرزا صاحب منطقی کے چشم و چراغ تھے، اصل مسودہ کو سنتے اور جواب کے ٹھوس ہونے پر تڑپ جاتے، عم محترم کی تصانیف میں یہ عربی لٹریچر بڑا باوقعت ہے مگر زمانہ کی بے توجہی میں ان کی کوئی تصنیف زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ صرف عملیہ چھپا جو مدرسۃ الواعظین کے دفتر سے نشر ہوا تھا۔

نتیجہ کلام

جب عنان قلم یہاں تک پہنچی تو یہ شبہ قوت رکھتا ہے کہ یاد علی داروغہ کو والد ماجد نے جوش شباب میں ہٹا کر ساری عمر کی تباہی برداشت کی، یہ رویہ ان کا کیا صحیح نہ تھا؟ نہیں نہیں ان کا فعل بڑا حکیمانہ اور گربہ کشتن روز اول (پہلے دن بلی کو مارنا) کی حد میں تھا۔ اس بغاوت میں جو کچھ نقصانات ہوئے، وہ ان کے ذاتی جان و مال سے تعلق رکھتے تھے جس شخص کا اپنی سرکار سے یہ باغیانہ رویہ ہو، اس کے اقدام سے ڈر جانا اور اس کو عہدے پر باقی رکھنا، قوی اندیشہ تھا کہ وہ وقف کے ہر جز کو اپنی ذاتی رائے میں غلط استعمال کرے اور یہ خود غرضی اس کے بقا کو واقفین کے شرائط کو بدل دے، اس لئے ان کی قربانی بالکل صحیح تھی، اور وقف کو ان کے غلط اقدام سے

کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

ملحوظ خاطر رہے کہ جائداد منقولہ کے علاوہ جو دو مکان والد ماجد کے وقف پر قربان ہوئے ہیں، ان میں وہ سہ منزلہ مکان جس میں موصوف کے تا حیات کتب خانہ اور مسجد و امام باڑہ کے فروش بلا کرایہ رہے، اس کے کمرے و کوٹھریاں علاوہ صحن کے چودہ مقامات جو قرض خواہ کے فروخت کرنے پر میری ہجرت کے وقت موجود تھا، اس مکان میں صوبہ بہار کے انگریزی اور اردو داں طلبہ بھی بلا کرایہ رہا کرتے تھے۔

دوسرا رہائشی مکان اس کے دالان کمرے و کوٹھریاں جو بیس ٹھکانے تھے جہاں ہم دونوں بھائی پرورش پا کر بڑے ہوئے اور والد مرحوم کا اسی مکان کے مغربی کمرے سے امام باڑہ کو بند دیکھ کر مرض موت شروع ہوا اور عربی شیعہ کالج کے مدرس اعلیٰ مفتئ اعظم مولانا محمد علی صاحب مرحوم خلف اکبر مفتی میر عباس صاحب مجتہد مرحوم نے اپنے قطع تاریخ میں ان کو مظلوم کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

دردا کہ رفتہ سوئے جناں کشتۂ محن
ظلم اعدا کار او کردہ تمام
پس شہید رنج و غم او را بگو
شد برائے تیر ہائے غم ہدف
آہ و واویلا و واویلا بگو(۱۰)

جناب ظفرؔ صاحب لکھنوی: ؎

جان لی ہاں غم نے ان کی آج آہ!

حق کا بول بالا

واقعات کو طول دینے کے بجائے یہ لکھ کر ختم کرتا ہوں کہ بھائی صاحب مرحوم تاحیات کمیٹی وقف کے ممبر رہے۔ میرے لکھنؤ چھوڑنے اور ان کی رحلت کے بعد ان کی اولاد کا وقف سے تعلق ہوا۔ اور اب عصر حاضر میں جب کہ میں حیات کے آخری دور سے گزر رہا ہوں وقف مذکورہ کی اس تشکیل نے اس نئی کمیٹی تک پہنچایا جس نے، جب قاتل رہا نہ مقتول

یا

قدح بشکست و ساقی نماند

(دیگ ٹوٹ گئی اور ساقی نہیں رہا)

وقف کو وقف خاص تسلیم کیا اور انتظامات وقف بورڈ کے تحت میں ہیں، امام باڑہ اللہ کے فضل و کرم سے موجود مگر وہاں کے ملکی حالات سے جلوس عزا بند ہیں۔ کتب خانہ اپنی ذاتی عمارت میں موجود ہے اور اس اعتراف میں مجھے کوئی عذر نہیں کہ اگر خان بہادر نواب سید مہدی حسن زندہ رہتے تو بلدیہ کی وہ اسکیم پوری ہوتی کہ مسجد تحسین اور امام باڑہ کے درمیان پارک بن کر خانہ خدا اور عزا خانہ ایک سطح زمین پر آجاتا اور نویں محرم کا وہ عظیم الشان مجمع زیادہ سے زمین پر بیٹھ کر شان مذہب باقی رکھتا، کتب خانہ غفران مآبؒ تو باقی نہ رہا، امام باڑہ کی مقدس زمینوں میں تغیر و تبدل ہوئے، مگر ممتاز العلماء کی جائداد اور وقف اپنی مسجدوں اور امام باڑوں کے ساتھ اور وقفی مکانات کو شامل کرتے ہوئے مع پرامیسری نوٹ اب بھی موجود ہیں اور خدام وقف انتظام کرتے ہیں۔ میری دلی تمنا جو تھی وہ یہ ہے کہ مقبرہ حکیم محمد علی مرحوم میں شامل ہوتا تو لطف تھا۔ اس عمارت کا شیعہ قوم کے قبضے میں آنا اور زمین کو غیر کے تسلط سے محفوظ رکھنا ایمانی فرض ہے۔

امامباڑہ میں موجودہ قبریں

گیا ہوا وقت ہاتھ آتا نہیں مگر ماضی کی یاد انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ اگر چہ وہ محسوسات میں نہیں ہے لیکن اگر ہم کسی شہر میں پہنچ جاتے ہیں تو افتادہ زمین دیکھ کر دل کہتا ہے: یہاں دوست کا خیمہ تھا، ادھر اس کے دوستوں کی سواریاں تھیں، سر بلند ناقہ کی عماری اور (یہاں) سواری کا گھوڑا بندھا تھا، اب کچھ نہیں، خاک اڑتی ہے مگر دل اس حسین منظر کو نہیں بھولتا اور خوشی سے دل باغ باغ ہے اور اگر کسی قبرستان میں پہنچ گئے تو ابھرتے ہوئے جذبات نے غم والم کی کروٹ لی ؎

ایک دن گور غریباں میں ہوا میرا گذر
دل کے داغ ابھرے ہوئے دیکھے بساط خاک پر

میں نے غلط عرض کیا، یہ گلستان نہیں ہے یہ تو امام باڑہ غفران مآبؒ لکھنؤ کا مقبول عزاخانہ ہے اور یہ قبریں زیادہ تر توان کے خاندان کی ہیں یا وہ لوگ یہاں دفن ہیں جو اپنے مرنے والوں کو مظلوم کربلا کی بارگاہ میں سپرد خاک کر کے ان کو عاقبت میں مدد پہنچانا چاہتے ہیں۔ گوشہ قبر میں عام سونے والوں کو عراق کے زیارت پڑھانے والے 'اسیران خاک' کہتے ہیں اور مجھ سے آثار قدیمہ کے ماہر چاہتے ہیں خاندان کی تاریخ زندہ رہے اور میں اپنی یادوں کی مدد سے دنیا کو بتاؤں، عزاخانے میں کون کون دفن ہے؟ ظاہر ہے میری سفری زندگی ہی تھی، ہمیشہ وطن میں نہیں رہا، کم از کم اس کی نشان دہی کر سکتا ہوں جو میرے سامنے دفن ہوئے یا وہ مشہور ہستیاں جن کی قبروں پر پتھر باقی ہیں، ان کو سپرد قرطاس کرو تو تم خود مصنف بن جاؤ گے اور اگر تمہاری صلاحیت بڑھی تو جو مشہور صاحبان کمال ہیں ان کا نام ''نجوم السماء'' کتاب میں ڈھونڈو اور اگر فارسی نہیں سمجھ سکتے تو ''تاریخ العلماء'' اردو میں تلاش کریں، بھارتی میرے وقف کردہ کتب خانے مدرسۃ الواعظین لکھنؤ جائیں اور کراچی کے ادیب میرے غریب خانے پر تشریف

لائیں، تاریخ العلماء کا ایک نسخہ خوش قسمتی سے رجب علی کی وقف کردہ کتابوں میں یہاں بھی موجود ہے۔

اماباڑے غفران مآبؒ زیر ضریح مبارک اور بیچ کا دالان، منبر والے درجے اور باہر کے دالان میں جو حضرات دفن ہیں، ان کے بعد ایک مختصر چبوترے پر وقف خاص کی زمین ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا نشان باقی ہے، مگر زمین ایک سطح پر ناہموار صورت میں ضریح مبارک کی طرف رخ کر کے ادب سے پیچھے ہٹتے چلے جاؤ تو زمین بلند ہوتی جائے گی اس زمین پر:

۱۔ سید مجاور حسین تمنؔا کی قبر ہے۔ میرے زمانے کے بہت بڑے ادیب اور خاص اولاد، انجمن گلدستۂ جناں کے بانی، لکھنؤ کے آخری فرقہ وارانہ فساد میں شریک تھے۔ تاحیات دینی وقومی خدمتیں کرتے رہے۔ جاویدؔ کے شاگرد رشید اور برادر نسبتی، امی شاعر چھنگا صاحب حسینؔ کے چھوٹے بھائی تھے، عظیم ذخیرہ کاغذات کا چھوڑا اور چاہتے تھے کہ ان کی موت کے بعد لاولد ہونے سے یہ اخبارات میرے پاس محفوظ رہیں مگر شبیر حسین دلؔ نے ان پر شاگرد کی حیثیت سے قبضہ کیا اور رڈی میں ایک آنہ سیر میں فروخت ہو گئے۔ نوحے کی بیاضیں لکھنؤ اور حیدرآباد دکن کی چھپی ہوئی پرانے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اگر مجھے دوبارہ بصارت خدا دیتا تو مکمل حال لکھ سکتا تھا۔ تنہائی میں ان کو موت آئی اور برادر حضرت عمدۃ العلماء مرحوم نے اپنی خاندان پروری سے جو نگراں مقرر کیا تھا، وہ غیر حاضر تھا، اکیلے دنیا سے گذرے اور غسل وکفن کے بعد اماباڑہ میں وقف خاص سے ذراہٹ کر دفن ہوئے۔ ان کے سپرد خاک ہونے پر آسمان سے بارش ہوئی اور خوب پانی برسا۔ یہ وہ غیبی برکت ہے جس کا اسلامی سیرت نگاروں نے اگر کسی کو یہ شرف حاصل ہوا تو اس کے حالات زندگی میں فخر کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مقام دفن کا پتہ یوں مل سکتا ہے کہ آپ منبر کی طرف رخ

کر کے صحن میں پہلے در کے سامنے بیٹھیں اور وقف عام کی زمین شروع ہو، یہ مزار بھی زیر سقف ہونا چاہیئے تھا اور وہ وقف خاص کے حقدار تھے۔تمنّاؔ کا ایک شعر جو ۱۳۲۶ھ کا کہا ہوا ہے، ان کے فکر کی بلندی کو دیکھو ؎

عقد قاسمؑ شہ نے اس (سے) وقت آخر کر دیا
خوف یہ تھا بھائی کی کوئی وصیّت رہ نہ جائے

۲۔ سید محمد تقی ابن سید محمد اصغر خویش مولوی سید ابوذر صاحب ۔۔۔۔۔فرقہ وارانہ فساد میں خاندان اجتہاد کی یہ وہ عظیم قربانی ہے کہ اگر میں قبر پرست ہوتا اس شہید راہ خدا کو اماباڑے ممتاز العلماء میں برمحل جگہ دیتا، میں لکھنؤ میں قبر کا مجاور بن کر تا زندگی مقیم رہتا اور میاں انوار کا باغ بنا دیتا۔ آپ نویں ربیع الاول کو فسادات اور کرفیو کی موجودگی میں اپنے دوست سید محمد شفیع عطارؔ کی مزاج پرسی کو چلے، سر کٹے نالے پر دشمن نے گھیرا بچہ آپ کی گود میں تھا جس کو زمین پر اتار کر مقابلہ کیا اور شہید ہو گئے وہ ذاکر حسین بھی تھے، میر محمد شاہ صاحب مرحوم کے خلف اکبر سید صاحب مرحوم سے تلمذ تھا۔ اپنے اماباڑے میں ان کو سنا۔ نخاس کے وقفی مکان میں قیام اور یحیٰ گنج کے چوراہے پر آٹا دال کی دکان تھی، خدمت خلق کے خوگر تھے۔تمنّاؔ مرحوم کے قریب ان کو بھی صحن عزاخانہ میں سپرد خاک کیا۔

۳۔ حضرت جاوید مرقومہ بالا دو قبروں کو اگر ہم سامنے رکھ کر کیننگ اسٹریٹ کی طرف پشت اور عمارت کے صدر دروازے کی طرف رخ کر کے نگاہ کرتے ہیں یعنی وکٹوریہ اسٹریٹ کی طرف چہرہ ہو) تو حضرت جاویدؔ کی قبر نظر آئے گی یعنی جب ہم دروازے سے گذر کر صحن اماباڑہ میں قدم رکھتے تو دروازے سے ملی ہوئی پہلی قبر مزار حضرت جاویدؔ ہے۔ ان کو بندہ کاظم کہنا نجابت سے جنگ اور جہالت ہے۔ وہ غفران مآبؒ کے عالی نسب پر پوتے تھے۔ ان کو غفران مآبؒ کے قرب میں دفن ہونا چاہیئے تھا، مگر جس کی مٹی جہاں کی ہوتی ہے، وہ

وہاں جگہ پاتا ہے۔ جاویدؔ پر تاریخ لکھنؤ میں کیا لکھا ہے اس کو آپ خود اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ میں دیوان جاویدؔ پر جو کچھ لکھ چکا ہوں وہ ادارے کی جدید پیشکش اطلاعات و تاثرات میں ملاحظہ کیجئے اور نئی بات یہ عرض کرتا ہوں کہ موجودہ دیوان جاویدؔ کے ایڈیشن سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے دو دیوان گم ہو گئے تھے۔ مجھے فخر حاصل ہے کہ والد ماجد مرحوم کی نوجوانی کا فوٹو مشکورالدولہ کی عکاسی میں جناب فرماتے تھے کہ دیوان جاویدؔ میرے ہاتھ میں ہے۔

۴۔ عُلیا مکرمہ جدۂ ماجدہ نام نامی بدرالنساء میری دادی کی بلند و بالا ذات تھی جو جناب غفران مآبؒ کی پوتی اور براہ راست دو پشتوں کے فاصلے سے غفران مآبؒ تک ان کا نسب پہنچتا ہے، خاندان اجتہاد کے بیشتر مرد و عورت ان کے شاگرد تھے، مجھ کو بھی ان کی شاگردی و تعلیم و تربیت کا مکمل شرف حاصل ہے۔ وہ جناب سید العلماء کی شاگرد تھیں اور اس لحاظ سے غفران مآبؒ تک میرا سلسلۂ شاگردی دو واسطوں سے پہنچتا ہے، وقف کے انقلاب میں ہم مجبور ہوئے تھے کہ دادی جان کو اپنے امامباڑے مین دفن نہ کریں، لیکن یہ تاریخی سب سے بڑا حادثہ ہے کہ جناب مرحومہ کو بھی صحیح جگہ یہاں نہ ملی۔ اب وہ اراضی امامباڑہ کے شرقی حجرے میں صحن کی طرف سپرد خاک ہوئیں جو کیننگ اسٹریٹ سے متصل ہے۔ یہ رنج و ملال دل و دماغ سے جاتا رہتا ہے جب خود امام حسنؑ کی قبر اس دور ظلم میں اپنے محل پر بن نہ سکی اور رسولؐ کی بیٹی جنت البقیع میں سپرد خاک ہوئیں۔

ناظرین اجازت دیں، ہم اندرون امامباڑہ پر کچھ نہیں کہہ سکے تھے جس کا بار آپ پر چھوڑا تھا، لیکن اب یہ عرض کرنا ہے کہ خطیب اہل بیت شمس العلماء مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ خاص اس صحنچی میں دفن ہیں جہاں غفران مآب آرام کرتے ہیں اور یہ دفن اس لئے ہوا کہ وہ بہ حیثیت داماد امامباڑے میں جگہ پا سکے، اسی طرح اس صحنچی محاذ میں یعنی منبر کے پشت والی صحنچی

جو ہمیشہ بند رہی، ملک کے سب سے بڑے سیاستداں جن پر غداری کا الزام نہ تھا خان بہادر نواب سید مہدی حسن مرحوم ومغفور جہاں دفن ہیں اس کا جواز اولاد ممتاز العلماء کی ایک بیوہ خاتون کے ساتھ عقد ثانی تھا اور وہ بحیثیت داماد جگہ پا سکے۔

۵۔ عقب منبر کی صحنچی میں اولاد غفران مآبؒ کے سب سے بڑے عالم مولانا سید محمد حسین عرف علّن صاحب قبلہ مرحوم متوفی (۱۳۲۵ھ) دفن ہیں۔ یہ واقعہ میری طفولیت (بچپنے) کا ہے مگر اس وقت بھی یہ صلاحیت پیدا ہو چکی تھی کہ جناب کی فاتحہ خوانی میں شریک ہونے والے محلے کے مجھ سے بڑے لڑکے شریک ہوئے تو مولانا مرزا رضا علی صاحب قبلہ خطیب عصر کا یہ نکتہ مجھے بھی اچھا معلوم ہوا کہ خطابت میں حالات زندگی پیش کرتے ہوئے قبر غفران مآب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

''ان سے ابتدا ہوئی اور ان پر خاتمہ ہوا''

دوسرا اشارہ پشت منبر کی طرف تھا اور مراد یہ تھی کہ اب ایسا بلند پایہ کوئی نہیں۔ جناب مرحوم کو صحیح معنوں میں لوگ بحر العلوم کہتے تھے۔ خودستائی ہوگی اگر میں یہ لکھوں کہ والد مرحوم نے میری تعلیم میں جناب کا اسلوب جاری رکھا اور ناظرین کو حساب کر کے مجھ پر نکتہ چینی کا حق ہے کہ جناب میر آغا صاحب قبلہ جن کا ۱۳۲۳ھ میں انتقال ہوا؛ چراغ ہندگل؛ ان کا سال وفات ہے، ان کی صورت تو آنکھوں میں پھرتی ہے۔ اور ان کے دسترخوان پر کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوا اور ان کے کئی سال بعد مرنے والے بحر العلوم کی صورت یاد نہیں، جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ ہمسایہ ہونے کا ہم کو شرف حاصل تھا اور بحر العلوم کا شریعت کدہ جوہری محلہ دوسرے علاقے میں تھا۔ شکر خدا ہے کہ یہ خادم دین ایک واسطے سے ان کا بھی شاگرد ہے۔ بحر العلوم فلسفہ وحکمت ومعقولات میں یقینا ممتاز انسان تھے۔

۶۔ خان بہادر نواب سید مہدی حسن جن کا ذکر آچکا ہے وہ بھی اسی صحنچی میں دفن ہیں۔ ان کی عظیم شخصیت پر تاریخ لکھنؤ گواہ ہے اور میرے بعض اساتذہ کا مقولہ اب معلوم ہوا کہ وہ کہتے تھے کہ اے اللہ میری عمر بھی خان بہادر کو مل جائے۔ ان سے بڑھ کے کوئی قومی رہنما نہیں ہے۔ مرحوم نے ۱۳۷۴ھ میں دنیا چھوڑی۔ سید سرفراز حسین خبیر مدّاح اہلبیت نے ان کی تاریخ کہی تھی ؎

خلد مسکن مولوی مہدی حسن بحر کمال

۱۳۷۴ھ

موصوف کی قبر بھی اسی صحنچی میں ہے۔

۷۔ اسی جگہ حضرت شمس العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ مجتہد العصر بھی سپرد خاک ہیں جن کی مقدس سیرت پر میرا مستقل مقالہ آپ ریاضی جنتری میں دیکھیں۔ انگریزوں کے دور میں خطاب یافتہ عالم دین ذاکری کے خاتم، تجوید کے استاد، سپاہ گری کے آخری ماہر، لحن داؤد کے مجدد، کاش ان کے حال پر مجھ میں قلم اٹھانے کی اب طاقت ہوتی۔

۸۔ ملحوظ خاطر رہے کہ میں صرف ان قبروں پر توجہ کررہا ہوں جو میرے علم ویقین میں ہیں۔ صحن کے طویل وعریض یا پہلو کے حجروں میں غفران مآب کے بڑے معزز شاگرد مفتی محمد قلی صاحب اور ان کے بیٹے مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ فردوس مآب بھی دفن ہیں اور قبروں پر حضیرہ ہے۔

میرے دور کے فلسفی مولانا سید محمد رضا صاحب مدرس معقولات اور مولوی مرزا عبد الحسین ''رجال بخاری'' کے مصنف جن کی کتاب ترجمان حقیقت ہونے سے ضبط ہوئی اور لکھنؤ کے ہر خاندان کے لوگ امامباڑے میں دفن ہیں اور یہ سلسلہ امامباڑے کے ایک شمالی جدید

دروازے سے بھرا پڑا ہے جس کے بعد میڈیکل کالج کی زمین شروع ہوتی ہے۔اماباڑے کی آراضی ختم ہونے پر زمین وقف کا وہ حصہ جو ایک چھوٹے دروازے کے بعد سلطان المدارس کو جاتا ہے جہاں ٹھاکر نواب علی خاں کی قبر ہے۔ اس میت کے دفن ہونے پر قوم میں اظہار بیزاری ہوا، اس لئے کہ وہ کسی سیاسی اور ملکی مصلحت سے عیسائی ہو چکے تھے، ماں ان کی بڑی مومنہ تھیں اور اس تبدیلی مذہب سے خوش نہ تھیں، ان کے پیسے سے سر بلند مقبرہ بنا جس پر قرآن خواں ہیں اور ٹھاکر صاحب کی بچت میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے ابھی بپتسمہ نہیں پایا تھا، اس کے علاوہ غنا پر ''مَعَارِفُ النَّغَمات ''ان کی یادگار وہ کتاب ہے جو گانے بجانے کا اساس ہے۔اس کتاب کی تشکیل کے وقت لکھنؤ میں عربی کا ذوق اس حد پر تھا کہ کتاب چھپوانے والے اردو نام نہ رکھ سکے، عربی کا سہارا لیا۔ دوسرا مقبرہ نرہی کے نواب سید انور حسین عرف نواب آغا جانی صاحب مرحوم کا ہے جو اماباڑے کے صحیح حقدار اور حضرت گنج لکھنؤ کے نامور امیر کبیر اور ہندو پاک میں محتاج تعارف نہیں۔انہیں عالیشان عمارتوں کے پڑوس میں میرے سگے ماموں سید صادق علی صاحب مرحوم دفن ہیں جو وقف خاص میں جگہ پانے کے حقدار اور علامۂ زماں جناب سید بچھن صاحب قبلہ کے داماد، خاندان انیسؔ کے والہ وشیدا اور جاویدؔ کے شاگردوں میں نمایاں تھے۔صادقؔ مرثیہ گوئی میں بھی ایک درجے پر فائز تھے۔ان کے سلام، مرثیے حضرت عروجؔ کے بعض نام نہاد شاگرد بہ قیمت خرید کر اپنے نام سے پڑھتے ہیں شہر میں ان کا وقار اس لئے تھا کہ وہ جناب شمس العلماء ابن حسن صاحب کے ہم زلف تھے، بڑے پر مذاق انسان، ہزل غزل میں بھی بند نہ تھے۔ان کی کہی ہوئی ایک ہجو سے چند شعر حاضر ہیں، جو میں چاک کر کے اس لئے ختم کر چکا ہوں جس کی قدح کی ہے اس کا ذکر خیر بزم میں ہونا چاہیئے نہ کہ برائی۔ یہ جذبہ لکھنؤ کا ایک تفریحی پہلو تھا، عداوت نہ تھی، کینہ نہ تھا، ملاحظہ ہو ؎

لے کر قلم زمین سخن گوڑ ساقیا

مضموں مزاح کا نہ کوئی چھوڑ ساقیا
نقشہ کھنچے وہ مے کا کہ تصویر بول دے
شکّر کے بدلے جام میں کیچڑ گھنگول دے

اس مسدس کا ایک مصرع بڑے غضب کا اور ملاحظہ ہو۔

ہے طاق دور شیشے کو کیوں کر اتاریئے

دوسرا مصرعہ بڑے غضب کا ہے جس کو نہیں لکھتا۔ مقام ادب ہے۔ ناظرین سورۂ فاتحہ سے لکھنؤ کے ہم عصر مرثیہ گو کو ایصال ثواب پہنچائیں۔

خاندان کے آثار باقیہ

جو عنوان بڑا ضروری ہے اور ایک سیرت نگار کو یہ کہنے کا حق ہے کہ آج غفران مآبؒ کو دنیا سے گئے ہوئے دوسو برس ہونے والے ہیں، مگر ان کی اور ان کی اولاد کی جگہ جگہ نشانیاں اور یادگار موجود ہیں۔ اگر ہم شاگردوں کی بحث اٹھائیں تو بڑا طول ہوگا، اور اگر اس وقت سے آج تک کے خاندانی تصانیف کی فہرست لکھتا ہوں تو ایک ہزار سے زیادہ مختلف علوم وفنون پر کتابیں موجود ہیں۔ کس میں طاقت ہے جو فہرست مرتب کرے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے اس ذخیرہ میں فہرست کامل تیار ہوسکتی ہے، مگر اب نہ شریک کار ہے اور نہ منشی ہے۔ اس کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت ہے۔ اجتماعی کوشش کی احتیاج تھی، دنیا کی کسی قوم میں اتحاد نہیں۔ کوئی سوسائٹی کسی کام میں ہر ہر فرد میں اتفاق نہیں رکھتی۔ خاندان اجتہاد بھی اقوام عالم کی طرح نہ متحد ہوا، نہ اب سب یکجا ہوسکتے ہیں۔

آپ کو شوق ہو تو میرے بعد بھی میرے کتب خانے کی فہرستوں سے سب تصانیف کے نام جمع ہوسکتے ہیں۔ عصر حاضر کی موجودہ نسل، خدا اس کو کامیاب اور باقی رکھے اور خاندان کے طلباء جو مشتغل ہیں یا فارغ ہوچکے، وہ اس خدمت کو انجام دیں تو کچھ تعجب نہیں، میرے عزیز

ترین فعال علامہ سید محمد حسین نقوی جو اس وقت دنیائے اسلام کی سیاحت میں مصروف ہیں، یہ کام خوب کر سکتے ہیں۔ اس خصوصیت نمبر دو کے بعد یہ بھی تیسری نشانی ہوگی اور آثار باقیہ میں اس کا شمار ہو سکتا ہے کہ کس عالم دین نے کتنی کتابیں چھوڑیں یا خاندانی کتب خانوں میں کتنی قابل فخر وناز کتب ہیں۔ ریاضی کے آلات اور کرہ اسطرلاب وغیرہ وہ عظیم نشانیاں ہیں جن پر توجہ ضروری ہے اور ان کتابوں کو بتانا میرا کام تھا کہ مخطوطات ممتاز العلماء اور میرے ذاتی وقف کردہ کس تعداد میں ہیں، مچھلی کے پیٹ میں جا کر صحیح وسالم نکل آنے والی کتاب لکھنؤ میں ہے، یہ ہمارا قابل فخر ذخیرہ ہے۔

امام باڑہ ومسجد آصف الدولہ اور ٹیلے کی بڑی مسجد

انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کرنے پر جو قدم اٹھایا ان میں سب سے خطرناک اقدام یہ تھا کہ ہمارے مقدس مقامات اور عبادت گاہوں کو قلعہ بنا کر فوجی طاقت قائم کی تھی۔ جنگ آزادی کے وہ چھوٹے چھوٹے حملے جو مختلف مقامات کے مسلمان ان پر کر رہے تھے، ان سب سے محفوظ رہنے کا بہترین ذریعہ بڑا امام باڑہ اور آصفی مسجد میں ان کی فوجوں کا سواد تھا۔ اور حق کے حمایتی اپنے غیر منظم ہونے سے انگریزوں کی افواج سے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ ہر مسلمان کے قلب میں صدمہ تھا اور خصوصیت سے وہ طبقہ اس دست درازی کو دیکھ کر مسجد نبوی میں گھوڑے باندھے جانے کی مصیبت کو آنکھوں کے سامنے لئے ہوئے تھا۔ کسی میں طاقت نہ تھی جو ان کو ہٹاتا۔ میرے جد امجد اور غفران مآبؒ کے پروتے شمس العلماء سید محمد ابراہیم مرحوم ومغفور نے اپنے روحانی اقتدار سے فائدہ اٹھایا اور ابھی تک ان کی پُرامن زندگی میں جس خاموشی سے مستقبل پر نظر کی تھی، وہ جناب کے حکومت سے خط وکتابت میں اس نتیجے تک پہنچا کہ آپ نے فوجیں ہٹائے جانے پر زبردست نامہ وپیام میں کامیابی حاصل کی اور

انگریزوں نے تسلیم کرلیا کہ بارگاہ حسینی اور خانۂ خدا میں فوجیں مداخلت فی الدین ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے نام نامی پر حکومت نے جو پہلا حکم صادر کیا تاریخ لکھنؤ میں صرف اس کی طرف اشارہ تھا۔ آخر میں سیاحوں کی کثرت سے آمد پر امام باڑے کا وقار ختم ہونے تک حکومت نے دوسرا حکم صادر کیا۔ اس موقع پر ہم اس حکم امتناعی کی پوری نقل پیش کرتے ہیں اور اصل ہماری لائبریری میں موجود ہے۔

اس حکم نے امام باڑے کی وسیع عمارت سے فوجیں ہٹائیں اور ان مقدس مقامات سے گولہ بارود، گھوڑے ہمیشہ کے لئے ہٹا دیئے گئے اور ٹیلے کی مسجد بھی واگزار ہوئی۔ یہ جدِّ مرحوم کی رواداری تھی کہ ٹیلے کی مسجد کو وقت سے فائدہ اٹھا کر اپنے فرقے کے قبضے میں نہ لائے اور حسب سابق اپنے مسلمان بھائیوں کے سپرد کردی۔ وہاں کا جمعہ و جماعت بھی بند تھا اور کسی میں ہمت نہ تھی جو اس مطالبے پر احتجاج کرتا۔ لیجئے مسلمانِ شہر دریا کے کنارے کے اونچے خانۂ خدا میں مدّت کے بعد نمازیں پڑھنے لگے اور شاہ پیر محمد کا مزار دوبارہ آباد ہوا اور مسجد تحسین علی خاں سے شیعوں کی نمازیں جمعہ و جماعت اور عیدین منتقل ہوکر آصف الدولہ کے جوار میں پہنچیں جو آج تک خدا کے فضل سے وہاں قائم ہیں۔ پہلے آپ اصل حکم ملاحظہ کیجئے اس کے بعد ترجمہ دیکھئے۔ اور یہ ملحوظ خاطر رہے کہ جدّ مرحوم نے اپنا قائم مقام اولاد کے کم سن ہونے پر اپنے بہنوئی جناب میر آغا صاحب قبلہ مجتہد مرحوم کو کیا جنھوں نے تا حیات خدمت بحیثیت قائم مقام انجام دی اور ۱۳۲۳ھ میں اپنے بھانجے اور داماد قدوۃ العلماء سید آقا حسن مجتہد کے سپرد کردی جو اس وقت بھی مؤخر الذکر کے ورثا انجام دیتے ہیں اور اولادِ جدّ مرحوم و مغفور نے امامتِ مسجد کو نزاعی بنانے سے پرہیز کیا اور یہ مقدس عہدہ بلا اختلاف اب بھی شہر کے ایک عالم کے سپرد ہے اور دوسرا جمعہ لکھنؤ میں کبھی نہ ہوا، نہ آج ہوتا ہے۔

To,

Syedul-Ulama Syed Mohammad Ibrahim
Mujtahid-ul-asar
Lucknow

For the guidance of soldiers visiting the great Imambara.

Lucknow, Brigade Orders, 22nd April 1885, 685 soldiers orders. Soldiers visiting the great Imambara, Machi Bhawan, will pay those marks of respect usual on entering places of worship by removing the helmet of forage cap. They are requested not to enter the Mosque (adjoining Imambara) or walk on the platform in front of the same. It is also lutely (absolutely) forlighen (forbidden) to take doors (dogs) into the great sequare. Those accompained by their dogs will have them tiedup before they enter the square. The general officer commanding trusts to the good feeling of the soldiers to carry out there orders.

Commanding officers will ensure that every soldiers in their respective corps is made acquainted with this order which will also he placed on the entrancegate.

By order
(Sd) W.V. ellis, Major
Brgade Major

بنام ۔۔۔۔۔۔سید العلماء سید محمد ابراہیم مجتہد العصر (لکھنؤ)

لکھنؤ بریگیڈ سولجر حکم نمبر ۶۸۵ بتاریخ ۲۲۔ ۴۔ ۱۸۸۵ء

ان سپاہیوں کی رہنمائی کے لئے جو بڑے اماباڑے کا دورہ کریں۔

وہ سپاہی جو بڑا امام باڑہ مچھی بھون کا دورہ کریں انہیں مندرجہ ذیل احکامات کی پابندی کرنا ہوگی۔ عبادت گاہوں میں داخل ہونے سے پہلے اپنی ٹوپیاں اتاریں۔ ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مسجد میں نہ داخل ہوں جو امام بارگاہ سے متصل ہے اور نہ ہی اس کے چبوترے پر چلیں۔ ان کے لئے مکمل پابندی ہے جو کتوں کے ساتھ دورہ کریں انہیں لازمی باندھ کر رکھیں۔ جنرل افسر جوان سپاہیوں کی رہنمائی کر رہا ہے اُسے اس حکم پر عمل کرنا چاہیئے۔

کمانڈنگ افسر یہ یقین دلائے گا کہ اس کے متعلقہ گروہ (دستہ) میں تمام سپاہی اس حکم

سے واقف ہیں جو داخلے کے گیٹ پر بھی لگایا جائے گا۔

بحکم

(ایس۔ڈی۔) ڈبلیو، وی ایلس میجر بریگیڈ میجر

کتب خانۂ ناصریہ جو اعداد و شمار میں بڑا قابل ذکر مکتبہ ہے اور کھجوہ کے علاقے میں مدّت دراز سے ایک زبردست علمی ذخیرہ ہے، اس کی بنیاد پر توابین[1] میں ایک صاحب ناقل ہیں کہ مولانا مفتی محمد قلی صاحب مجتہد مرحوم کو ان کے استاد نے صرف پانچ روپے بطور اعانت دیئے اور انہوں نے صرف ایک روپیہ اپنے ذاتی خرچ میں صرف کیا اور باقی کتابیں خریدیں۔ اس پہلی عطا کا یہ پھل تھا۔

اور معطی کی نیت کا اثر اور پانے والے کے ارادے کی برکت تھی کہ کتابیں بڑھنا شروع ہوئیں اور نتیجہ میں یہ لائبریری مولانا حامد حسین صاحب قبلہ کا کتب خانہ مشہور ہوکر آخر میں 'کتب خانہ ناصریہ' کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ اور اس میں سواد اعظم کی زیادہ سے زیادہ کتابیں یکجا ہیں۔ فاضل ورثہ نے اپنی اعلیٰ سیاست اور حسنِ انتظام سے یو۔پی۔ گورنمنٹ کو دے دیا اور آج بھی یہ گراں بہا ذخیرہ اُتر پردیش کی حفاظت میں ہے۔ والد ماجد فرماتے تھے کہ یہاں مجلس کے رقعے تک جلد بندھوا کر محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اس وقت اس ارشاد کی میری نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی مگر جب میں نے خود اپنی لائبریری کے لئے مجلسوں اور میلاد اور

[1] یہ لفظ میرے نزدیک قاتلان حسین کے خون ناحق کا انتقام لینے والوں میں سب اشخاص کے لئے صحیح نہیں، خصوصاً مختارؒ قید و بند میں تھے، ان کو واقعہ کربلا کی خبر نہ تھی، جب وہ لاعلم تھے تو ان پر نصرت حسینؑ نہ کرنے کا کوئی گناہ نہ تھا۔ ہاں وہ لوگ جنہوں نے جان بوجھ کر مصلحت وقت سے جان بچائی، وہ اس لفظ کے اندر شامل کئے جا سکتے ہیں، اس لفظ کو مختارؒ ایسے مجاہد اعظم جس کو امام نے 'عبد الصالح' فرما کر حضرت عباسؑ کے دوش بدوش جگہ دی اس کو توابین میں شمار کرنا جسارت اور واقعۂ کربلا کو نظروں سے پست کرتا ہے۔

دوسری تقریروں کے ہینڈ بل جمع کئے تو اب اندازہ ہوتا ہے کہ جہانگیر خان، اچار چٹنی ومربہ جات لکھنؤ میوے والی سرا کے مشہور تاجر کی طرف سے میلاد شریف کا اشتہار کن لفظوں میں شائع ہوتا تھا اور میر خورشید علی صاحب نفیسؔ مرحوم ومغفور کی دیوگاؤں میں ایک مجلس کا رقعہ کس شان کا تھا، یہ ہماری تاریخ ہے جس کے یکجا کرنے کو اسلاف نے بتایا۔

امام باڑہ جنت مآب

لکھنؤ کی پرانی آبادی حلقہ چوک میں مسجد تحسین علی خاں کی پشت پر واقع ہے۔اس امام باڑہ کی بنیاد ممتاز العلماء سید محمد تقی صاحب قبلہ مجتہد مرحوم کے ہاتھ سے واقع ہوئی جو مذہب شیعہ کے نامور مجتہد تھے اور شاہان اودھ کی طرف سے ممتاز العلماء فخر المدرسین کا خطاب حاصل تھا۔ ۱۷ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ مطابق ۸ رجولائی ۱۸۶۸ء کو اس امام باڑے کا سنگ بنیاد نصب ہوا اور آخر ذیقعدہ ۱۲۸۷ھ مطابق فروری ۱۸۷۱ء میں بن کر تیار ہوا۔جس وقت امام باڑے کے در قائم ہوئے اس وقت ناظم صاحب مرحوم نے طنزیہ کہا تھا کہ فیل خانہ ہے، لیکن جب مجلسیں شروع ہوئیں اور یہ امام باڑہ مجلسوں سے چھلکنے لگا اور بانی کے پرخلوص ارادے کی وقعت دلوں میں قائم ہوئی۔تمام عمارتی سامان ازقسم چوب وخشت پاک کر کے مسلمان کاریگروں کے ہاتھ سے عمارت بن کر تیار ہوئی۔ پہلے دو درجے تھے، عقب کا درجہ ممتاز العلماء کے فرزند فردوس مکان نے اضافہ کیا۔امام باڑہ جب بن کر تیار ہوا تو کوئی تاجر عراق سے خاک شفاء کی ضریح لایا تھا، لکھنؤ کا کوئی رئیس اس کے حسب دلخواہ قیمت نہ دے سکا، اس نے ضریح مبارک امام باڑے میں چڑھا دی، جو اب تک موجود ہے (اس ضریح کے خصوصیات اس سوانح عمری کے آئندہ صفحات سے آپ کو معلوم ہوں گے اور خدا کا عظیم احسان یہ ہے کہ اس کا ایک جز جو قریب ایک انچ کے ہے ہماری لائبریری میں موجود ہے۔تفصیل کا انتظار کیجئے) درجہ دوم بہت وسیع اور

طویل وعریض ہے۔

امام باڑہ آصفی کے علاوہ کوئی اور امام باڑہ اتنا وسیع نہیں ہے۔ (شہر کے عظیم اجتماعات اسی عزاخانہ میں ہوتے رہے۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس لکھنؤ کی طرف سے روضۂ امام رضاؑ پر گولہ باری کی مجلسِ احتجاج مولوی سید علی غضنفر جنرل سکریٹری کی طرف سے اسی عزاخانہ میں ہوئی اور استاد الواعظین مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کی خطابت یادگار مجلسِ غم تھی، یا حضرت عارفؔ، یادگار انیسؔ کی اچانک موت پر مولانا سید محمد رضا صاحب فلسفی کی عالمانہ تقریر اور شیعہ کالج کی تحریک کے موقع پر یہ موضوعِ سخن کہ فائدہ رساں علم اور نقصان دہ علوم میں صحیح راستہ کدھر ہے، دوسرے نامور شاعر میر انیسؔ کے واحد نواسہ پیارے صاحب رشیدؔ کی مجلس چہلم کی بنا پر عزاخانے کے عظیم الشان اور قابلِ ذکر اجتماعات ہیں) پہلوؤں کی صحنچیاں دومنزلہ ہیں جن میں بالائی حصہ پر خواتین شریکِ مجلس ہوسکتی ہیں۔

درمیانی درجہ اس قدر وسیع ہے کہ سوائے نہم محرم کی مجلس کے لبریز نہیں ہوتا۔ وسطی درجے کے غربی صحنچی میں ممتاز العلماء اور فردوس مکان کی قبر مبارک ہیں جس پر چوبی حضیرہ نصب ہے اور سنگ مرمر کے لوح مزار ہیں۔ ممتاز العلماء نے اپنے گھر میں جو مجالس قائم کی تھیں وہ اس امام باڑہ میں منتقل ہوکر مزید کامیاب رہیں۔ مگر افسوس ہے کہ دوسال سے زیادہ بانی اوّل محرم نہ کرسکے۔ ممتاز العلماء کی زندگی میں امام باڑے میں پرانے طرز کی ذاکری کی گئی۔ حدیث خوان یکے بعد دیگرے پڑھا کرتے، اُس وقت ابتدائی ذاکر مولانا مرزا رضا علی صاحب منطقی تھے اور آخری ذاکر مولانا میر سید علی صاحب مرحوم (مجالس علویہ کے مصنف) یا میر محمد شاہ صاحب مرحوم ہوتے تھے۔ یہ طرز تیسرے متولی تک قائم رہا۔ نویں کی مجلس میں سحر کے وقت سے شمع کی روشنی میں لوگ آنا شروع ہوجاتے تھے اور جس گریہ وبکا کی مجلسیں اس امام باڑے میں ہوئیں اس کی نظیر شہر میں نہ تھی۔ اس امام باڑہ اور حدود عزاخانہ کے گرد جن اہل علم کی قبریں

ہیں اُن میں حسب ذیل مجتہدین زیرزمین محوخواب ہیں:

(۱) ممتاز العلماء طاب ثراہ

(۲) مولانا میر حیدر علی صاحب جو مفتی میر عباس صاحب کے معاصر تھے' کواکب دُریۂ ادب کی مشہور کتاب میں ان کے عربی خطوط موجود ہیں۔ مدرسۂ ایمانیہ کے مدرس اعلیٰ تھے، پشت امام باڑہ پر جو مثلث قطعہ آراضی ہے اس پر آرام کرتے ہیں۔ مولوی سید جعفر حسین صاحب سابق معلم دینیات شیعہ کالج لکھنؤ انہیں کی نسل سے تھے۔

(۳) مولانا میر باقر حسین صاحب قبلہ مرحوم، مولانا سید نثار حسین صاحب عظیم آبادی کی کتاب الاجازات مطبوعہ ۱۳۱۱ھ میں موصوف نے جو اجازے دیئے ہیں وہ موجود ہیں۔ آپ مولانا محمد حسین صاحب کے فرزند تھے۔ مولانا کے خلف صالح حکیم میر حیدر حسین صاحب مرحوم مقبرے گوالٹولی کانپور میں مطب کرتے تھے اور ان کے فرزند مولوی امیر حسین صاحب بھاگلپور وقف عمدہ بیگم صاحبہ میں پیش نماز تھے۔

(۴) جناب سید جعفر صاحب قبلہ۔ جناب سید محمد باقر صاحب قبلہ کے بڑے بھائی تھے، علم وعمل میں اپنی آپ مثال اور ممتاز العلماء کے نواسے تھے۔ باقر العلوم مرحوم اپنے سگے بھائی کی قبر پر فاتحہ کے لئے زندگی بھر آتے رہے۔ یہ قبر وسطی درجہ منبر کے سامنے وقف خاص میں غیر نمایاں زمین دوز ہے۔ رجب ۱۳۲۱ھ میں کثرت بارش سے امام باڑہ کے درجہ اوّل کو نقصان پہنچ گیا۔ اور نواب مرزا محمد عباس علی خان خلف مرزا ناظم صاحب نے اپنے صرف سے از سرنو اس دالان کو تعمیر کروایا۔ اس امام باڑے کا وقف ہونا جناب ممتاز العلماء کی کسی تحریر سے ثابت نہیں۔ جناب فردوس مکان نے نقشہ تقسیم آراضی میں تحریر کیا ہے کہ امام باڑہ وقف خاص ''براولاد واز واج واصہار واز واج اولاد'' ان ہی فقرات کے لحاظ سے حدود امام باڑہ میں اولاد واز واج کے سوا کسی غیر کو جگہ نہیں ملی۔ یہ نقشہ تقسیم باہمی مقدمہ وقف میں

پیشِ عدالت نہیں ہو سکا تھا۔فیصلہ مقدمہ کے بعد مدت دراز تک وقف عام سمجھنے والوں کے روبرو رہا اور تمام خاندان کی دستخطیں بانیان مقدمہ کا سر تسلیم خم کرتی رہیں۔اس جُز عبارت کا نقشہ میری پہلی تصنیف احیاء الآثار سوانح ممتاز العلماء قلمی میں موجود ہے۔قوی امید ہے کہ موجودہ ممبران کمیٹی نے اس ثبوت قوی کو اپنے محافظ خانے میں رہنے دیا ہو۔

جناب ممتاز العلماء کے انتقال کے بعد مجالس کو فردوس مکان نے انتہائی عروج دیا۔امام باڑے کا ایک درجہ بڑھایا، صحن میں وسعت دی، نویں کی مجلس میں بیرونجات کے مخلصین کو مخصوص دعوت نامہ بھیج کر مدعو کرنا، حکامِ ضلع اور بڑے بڑے افسران کی موجودگی اسی دور میں ہوئی۔عہد ممتاز العلماء میں اس مجلس کے شرکاء میں تمام شہزادگان، اُمراء اور لکھنؤ کے سر برآوردہ وہ عمائد تھے جو کہیں نہ جاتے تھے، وہ اس امام باڑے میں آنا فخر سمجھتے تھے، شہزادہ مرزا اخرم بخت بہادر خلف اکبر حضرت فردوس منزل محمد علی شاہ بادشاہ نواب والا قدر کیواں جاہ تھا۔محسن الدولہ معظم الملک محسن علی خان بہادر غضنفر جنگ، ممتاز الدولہ مدبّر الملک حسن علی خان تیمور جنگ بہادر، نواب محسن الدولہ مرزا امام علی خان بہادر، شاہزادہ مرزا رفیع الشان بہادر (سیاحتِ ظریف مطبوعہ لکھنؤ میں اس خاندان کی جلالت کا ذکر ہے) شاہزادہ مرزا عظیم الشان صاحب، نواب مصطفیٰ علی خان بہادر، مرزا حیدر شکوہ بہادر، شاہزادہ سلطان مرزا دارا سطوت مرزا محمد رضا علی بہادر، مرزا محمد تقی خان فیل جنگ، نواب سعید الدولہ بہادر، نواب شرف الدولہ بہادر، نواب اشرف الدولہ بہادر، نواب مرزا عالی جاہ بہادر، نواب مرزا والا جاہ بہادر، نواب مرزا علی خان خلف نواب قاسم علی خان قائم جنگ، مرزا علی مہدی خاں ابن زین العابدین خان عرف مرزا مینڈو صاحب اور کتنے رؤساء و عمائد سر برہنہ نوحہ کناں نظر آتے تھے۔درمیانی درجے میں صدر مجلس، رؤسا و شاہزادگان کی صفیں ہوتی تھیں۔جو جس جگہ بیٹھتا، مجال نہ تھی کہ اس پر دوسرا شخص

بیٹھ جائے۔ یہ اس وقت کی وضعداری (چلن) تھی۔ روٴساء و امراء کے قالین پہلے سے آ کر بچھ جاتے تھے جس کی مصاحب نگرانی کرتے تھے اور ان رئیسوں کے آتے وقت جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ نویں تاریخ کی گریہ و بکا قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی۔ جناب مفتی میر عباس صاحب نے ممتاز العلماء کا جو مرثیہ نظم کیا اس میں یہ شعر اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"در ایامِ ماہ محرم ازو
عجب مجلسے در عزائے امام"(۱۱)

۱۳۰۲ھ میں حضور پرنور شاہزادہ مرزا محمد سلیمان قدر بہادر نے نویں محرم کی مجلس کا فوٹو لیا اور دو تصویریں ایک کارڈ سائز پر، دوسری فل سائز سے کسی قدر بڑی تیار کرانا چاہیں، مجھ سے حیدرآباد دکن کے قیام میں جناب مولانا میر سید علی صاحب مرحوم کے نواسے نے بیان کیا کہ جب کیمرہ نصب ہوا تو تمام مجلس کی نگاہیں اس سمت تھیں اور جناب مولانا سید علی صاحب کو حاضرین کی توجہ ذاکری کی طرف مبذول کرنے میں مشکلات کا سامنا ہوا۔ تصویر نہ لی جاسکی اور جب مجلس ختم ہوئی تو شبیہوں کی زیارت اور سینہ زنی میں لوگ مصروف ہوئے، اس وقت یہ تصویر لی گئی (یہ فوٹو ادارہ جمعیت خدام عزا کراچی کی پیش کش "زعفر جن" کے ٹائٹل پر آپ دیکھ چکے ہیں) اس تصویر کو لکھنوٴ کے مشہور ادیب اور مصوّر نواب بہادر حسین خان انجم نے تیار کیا اور حسب ذیل اشعار بھی فوٹو پر لکھے: ؎

حسب ارشادِ جناب وارثِ تاج و سریر
صاحب عالم سلیماں قدر شیدائے امامؑ
ایں شبیہ مجلس سبط رسولؐ انجمؔ کشید
تا بماند اہلِ دیں صرف زیارت صبح و شام
از محرم بود تاریخ نہم مثل دہم

در سحر معراج منبر ذکر شاه تشنه کام
در مکان سید ابراہیم صاحب مجتہد
بود این بزم عزائے شه برائے خاص و عام
کن سر اعدا جدا (از) بہرسال آن بگو
اَنفس و مقبول بزم ماتم شاہِ انام(۱۲)

۱۔۱۳۰۳=۱۳۰۲ھ

جس خیمے میں شبیہیں، دلدل و تابوت وعلم و گہوارہ سجائے جاتے، وہ صحن امام باڑہ کے آخری حصہ متصل مکان سید محمد حسین پیش نماز خویش سید العلماء سے متصل اور اس کے بعد محمل و کجاوہ اور شتر کا بلند خیمہ نصب ہوا کرتا۔ تین ذوالجناح ایک پر تیروں کی شبیہ، دوسرے راہوار پر حضرت قاسمؑ کا تاج اور سہرا، تیسرا گھوڑا حسین آباد مبارک کے جلوس کا شاہی سامان سے آراستہ اعلیٰ اسپ جس کو کوئی شہسوار ہی لے جا سکتا تھا۔ میرے وقت میں اغن صاحب شہسوار بڑے احترام سے لے جاتے اور اہل ایمان اس سواری پر نوحہ وفغاں میں شور گریہ برپا کرتے۔ جناب فردوس مکان کے دور تک لکھنؤ میں جب تک امام باڑے کی مجلس ختم نہ ہوجاتی تھی کہیں مجلس منعقد نہ ہوتی تھی۔ یہ شور وشین زوال آفتاب کے وقت تک جاری رہتا اور زنانی مجلس کے لئے خواتین کو جو وقت دیا جاتا، اس کے لئے اماباڑے کے پانچوں در کا شامیانہ گرا کر پردے میں آجاتے اور نابالغ لڑکے اپنے کاندھوں پر شبیہوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ کچھ خواتین نوحہ خوانی میں جابجا مصروف، کوئی منبر پر مرثیہ خوانی کرتی۔ یہ تھا امام باڑہ کا امتیاز، ہر شبیہ ضریحِ مبارک تک پہنچتی۔ اونٹوں کو لے جانے میں کوئی خاندانی بزرگ نقاب پوش اندر داخل ہوتے اور کافی ہوشیاری سے واپس ہوتے۔ ضریح مبارک پر ''ناڑے''، ''چلے'' کثرت سے حاجت مند

باندھتے۔ضریح مبارک یعنی تحت قبہ ذاکر حسین ابن امیر علی کی بیوی تبرکات حاصل کرتیں اور نذر و نیاز کی رقوم حفاظت سے رکھتیں۔ان خاتون کا قیام بطور مجاور غربی صحنچی سے متصل مکان میں ہمیشہ رہتا۔

تیسرا دور میرے والد ماجد کا تھا جس میں آخری ذاکر قاری مرزا محمد علی صاحب ایک صاحب کمال تھے اور محقق ہندی مولانا محمد حسین صاحب قبلہ (محلہ رکاب گنج) کے عشرے میں لکھنؤ رہ جانے پر آخری ذاکری ان کی ہوتی اور وہ گھنٹہ بھر سے کم فضائل اور مصائب نہ پڑھتے۔یہ وہ وقت ہے جب ذاکری نئے لباس میں آچکی ہے اور مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کا ہر طرف شہرہ ہے۔محقق ہندی کے بعد آخری ذاکر مرزا محمد ذکی پسر مرزا محسن خاتم قرار پائے۔ بڑے قادرالکلام محدّث تھے۔ان کی موجودگی میں چچا جان کے عراق سے واپس ہونے پر مجلس ان پر ختم ہوتی۔یہاں تک کہ والد کا دَور ۱۹۱۹ء مقدمہ وقف کی زد میں ختم ہوا۔جس کے واقعات سے یہ کتاب میری کوشش ہے کہ جامع ترین اور سیر حاصل صحیفہ ہو۔

کیفیت ماتم

ذاکری ختم ہونے پر سر برہنہ مجمع امام باڑے کے تین حصوں میں پایا جاتا ہے۔ضریح مبارک کے دالان میں انجمن مظلومیہ (حسن پوریا) کا دستہ اور زیر منبر کے وسیع وعریض درجے میں وزیر گنج اور گولہ گنج اور عام مومنین مصروف سینہ زنی ہوتے رہتے۔اس میں کسی ماتمی انجمن کا گروہ نہ ہوتا۔باہر کے دالان میں انجمن ذوالفقار حیدری قمع کا ماتم کرتی۔یہ خوں ریز منظر بڑا دلدوز اور مؤثر ہوتا،انجمن کے سر برآوردہ رکن تو کراچی میں انتقال کر چکے ہیں۔اصغر حسین نقیب

کا علم نہیں۔ وہ بڑے پُراثر آواز کے نوحہ خوان تھے جن کے مسدس ختم ہونے پر شور گریہ بلند ہوتا۔ اور خون کی چھینٹیں مجمع تک پہنچتیں۔ شبیہوں کے آنے پر ہر ماتمی گروہ گزرنے کی جگہ دے دیتا۔

آج مجھے لکھنؤ کو چھوڑے ہوئے ۲۲ سال گزرے۔ پر اس مجلس کے شریک ہونے والے اہلِ شہر ضرور پاکستان کے شہروں میں بکھرے ہوئے ہوں گے، جن کے ناموں کے اظہار کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ حکیم اقبال رضا صاحب مرحوم صدرالا فاضل کے صاحبزادے عزیز آباد میں موجود ہیں، نام ذہن میں نہیں رہا۔ اور زنانے میں شبیہیں لے جانے والے وہ بچے جو بڑے جوش سے علم اور تابوت لے جاتے تھے ان میں کا ایک نام جوادھیڑ عمر تک پہنچ رہے ہیں، وارثِ کمالاتِ انیس اور حضرت فائق لکھنوی کے اکلوتے بیٹے سید اصغر حسین شائق لکھنوی وہ ہیں جو اپنے بچپن کے اس شرف کو ظاہر کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ باہر کے شریک ہونے والے مومنین میں مشہور ترین کراچی کی فرد اور نشتر پارک کے اجتماعات عزا کی روح رواں باقر حیدری صاحب نویں کی مجلس فراموش نہیں کر سکے، انہوں نے آخری دور کی مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کی مجلس میں شرکت کی۔ خداوند عالم وطن میں بند کی ہوئی عزاداری کو واپس لائے۔

عزاداری بند کرانے میں جس کا ہاتھ ہے اسے افرادِ قوم پہچانتے ہیں، یہ شیعیت کا ایک امتحان ہے، جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ وہاں کے رہبر اپنی تکلیفِ شرعی کو خوب سمجھیں۔ میری ناچیز رائے اس وقت یہ تھی کہ لکھنؤ کی عزاداری ختم ہونے پر اطراف میں جو رونق بڑھ گئی۔ رائے بریلی، فیض آباد، کانپور میں عظیم جلوس اور اہل ہنود کے ماتمی دستے۔ سکھوں کی المیہ نظمیں اور نوحے جو وہاں کے اخبارات سے یا کیسٹ کے ذریعے ہم سنتے رہتے ہیں، اس تقسیم غم کے ساتھ اور اولادِ غفران مآبؒ اپنی طرف سے نصیر آباد میں خود امام باڑہ غفرانمآبؒ کی مجلسیں ان

کے وطنی امام باڑے میں پہلی محرم سے نویں محرم تک کریں۔اور اس طرح نصیر آباد کا منہدم شدہ امام باڑہ بھی بنے اور یہ نہ کہا جائے کہ غفران مآبؒ کے امام باڑے کی مجلسیں بند ہوگئیں مگر ع

کون سنتا ہے فغانِ درویش

آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد سلمہٗ کی ہردلعزیز ہستی......مجھ سے بہت بہتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ وقارِ رفتہ کو زلیخا کے شباب اور حضرت یوسفؑ کے زندہ و سلامت گھر پلٹنے کی طرح دوبارہ پلٹائے۔''بحقِ محمدؐ وآلِ محمدؐ''

آخری متولی یعنی والد ماجد نے اپنے ابتدائی دورہ میں صحن امام باڑہ کا چبوترہ بڑھایا اور قمری سال کا وہ عشرہ محرم جس میں ۲۱/مارچ کی تاریخ نوروز پڑی، مجھے خواب سا یاد ہے کہ محقق ہندی سید محمد حسین صاحب قبلہ (رکاب گنج) لکھنوی نے نوروز پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ ۹/روز کیسے؟ ہائے اب نہ ایسے پُرخلوص ذاکر پیدا ہوں گے، نہ ویسے سامعین۔ یہ لفظ ۹/ کا نکتہ غدیر کے دن ۲۱/مارچ پڑنے اور کعبہ میں بت شکنی اور اس روزِ سعید میں دوسری عیدوں کا پڑ جانا سب کی طرف اشارہ ہے۔اور تولیت ختم ہونے پر امام باڑے کا پورا فرش (چاندنیاں) نیا بنوایا۔اس وقت ایک کپڑا سلیٹا نام کا ٦٦ گز کا تھان ہوا کرتا تھا۔وہ جازم جب نہ رہیں جو واقف کی بنوائی ہوئی تھیں۔

صحیفۂ کاملہ

آج کل کے ہوشمند اور دانا یہ چاہتے ہیں کہ تمام نوعِ انسان کے لئے ایک عقلی (ریشنل) دین تجویز کریں، لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ یہ کام خدا نے قرآن مجید سے لیا ہے اور آیات قرآن نے مذہب کو اس حسین انداز سے پیش کیا ہے جو کسی طرح خلاف فطرت نہیں ہے۔ احادیث نبویؐ اور روایات ائمہ نے بھی اس مقصد کی تکمیل میں حصہ لیا ہے جن کا کوئی مطالعہ کرنے والا نہیں۔اس مبارک جدوجہد کی دو حیثیتیں ہیں:

(۱) روایات اور اخبار جو مختلف کتب میں درج ہوئے۔

(۲) ملفوظات وخطبات جو یکجا مدوّن ہوئے، ان کی سیر سے بھی مذہب اپنے اصلی خدوخال میں نظر آتا ہے۔

نہج البلاغہ اور غرر الحکم اور دیوان منسوب حضرت امیرؑ کے مجامیع، صحیفہ سجادیہ وصحیفہ ثانیہ کلام حضرت سید الساجدینؑ اور مصباح الشریعۃ کلام امام جعفر صادقؑ، فقہ رضوی اور صحیفۃ الرضاؑ، کلام امام ضامن وثامنؑ وہ علمی ذخیرے ہیں جن میں ہر کتاب خامہ فرسائی کے لئے مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اس کا مطالعہ ایمان پر جلا کرتا ہے۔

مدرسۃ الواعظین کے فاضل واعظ مولانا سید نجم الحسن صاحب کراروی صدر الافاضل متعینہ پشاور صوبہ سرحد نے مجھ سے کئی بار فرمایا کہ صحیفہ کاملہ پر کچھ لکھوں۔ علمی مشاغل میں یہ فرمائش پوری نہیں ہو رہی تھی اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ جمادی الاولیٰ کے نمبر میں صحیفہ کاملہ پر ایک سرسری مضمون قلمبند کروں گا۔ الحمد للہ کہ وقت آیا اور صحیفۂ کاملہ کے صرف ایک نسخۂ قلمی پر بحث کرنا چاہتا ہوں جو دنیا کا نادر الوجود کتبہ ہے۔

صدر کلام میں ناظرین (الواعظ) کو اس امر پر متوجہ کرنا ہے کہ صحیفہ کاملہ فریقین میں مسلمہ حیثیت رکھتا ہے اور زبورِ آل محمد کا خطاب شیخ سلیمان بلخی نقشبندی وغیرہ کا تجویز کردہ لقب ہے اور صحیفہ کی دعائیں اس قدر بلند پایہ ہیں کہ ان کو غیر شیعہ عالم بھی نقل کرتے ہیں:

"اَلْبَابُ الثَّامِنُ وَالتِّسْعُوْنَ فِیْ اِیْرَادِ بَعْضِ الْاَدْعِیَۃِ وَالْمَنَاجَاتِ الَّتِیْ فِی الصَّحِیْفَۃِ الْکَامِلَۃِ لِلْاِمَامِ الْھُمَّامِ زَیْنِ الْعَابِدِیْنَ وَھِیَ زَبُوْرُ اَھْلِ الْبَیْتِ الطَّیِّبِیْنَ سَلَامُ اللہِ عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ"[1]

---

[1] ینابیع المودۃ، ص:۴۱۵ چاپ مصر

''باب نود وہشتم (۹۸) میں بعض ادعیہ اور مناجات ہیں جن کا ماخذ صحیفۂ کاملہ امام ہمام زین العابدین علیہ السلام ہے اور وہ اہلبیتؑ طاہرین کی زبور کہلانے کی مستحق ہے''

صحیفہ میں انسانی معاش اور معاد پر مکمل بحث ہے۔ انہیں خصوصیات کا تقاضہ تھا کہ علمائے شیعہ نے صحیفہ کا خیال رکھا اور سختی سے ضرورت محسوس کی کہ اس کتاب کی بقاء رہے اور وہ الفاظ جو امام کے دہن مبارک سے نکلے تھے، آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رہ جائیں۔ سلف صالحین میں علی بن احمد سدید علیہ الرحمہ وہ خوش بخت شخص تھے جن کو ان سے قبل کے عالم علی بن سکون رحمہ اللہ کا لکھا ہوا صحیفہ دستیاب ہوا۔ اس صحیفہ پر عمید الروساء کی محترم تحریریں تھیں اور علامہ ابوجعفر قاسم بن حسن محمد بن حسن بن معیہ اس کو من وعن پڑھ چکے ہیں۔ یہ وہ خصوصیات تھے جن کی روشنی میں صحیفہ ایک تابندہ ستارہ معلوم ہوتا تھا۔ شہید اوّل محمد مکی علیہ الرحمہ کے علم افروز دور تک یہ صحیفہ موجود تھا جس کو زیر نظر رکھ کے جناب علامہ نے اپنے دست مبارک سے نقل کیا۔ اور ان کی شخصیت وعظمت نے اس نقل کو اصل کے دوش بدوش پہنچا دیا۔ تاریخ سے یہ تو پتہ نہیں کہ کب تک وہ نسخہ باقی رہا مگر نسخہ شہید کے بارے میں یہ رائے آسانی سے قائم ہو سکتی ہے کہ قلعہ شام کے جیل میں جانے سے پہلے شہید نے اس صحیفہ کو تحریر فرمایا ہے۔ ان کی جگر سوز وفات اور نام نہاد مسلمانوں اور برادرانِ یوسف کے ہاتھوں بیدردی کے ساتھ قتل ہونا ارباب تاریخ نے یوں لکھا ہے:

قُتِلَ رَحِمَهُ اللهُ بِالسَّيْفِ سَنَةَ ثَمَانِيْنَ وَسَبْعَ مِأَةَ ثُمَّ صُلِبَ ثُمَّ رُجِمَ ثُمَّ أُحْرِقَ بِدِمِشْقٍ فِي دَوْلَةِ لِيَّةٍ يَرْدُ وْ سَلْطَنَة بِرْقُوقٍ بِفَتْوىٰ الْقَاضِي بُرْهَانِ الدِّيْنِ الْمَالِكِيّ وَعِبَادِ بْنِ جَمَاعَةِ الشَّافِعِي بَعْدَ مَا حُبِسَ سَنَةً كَامِلَةً مِنْ قِلْعَةِ الشَّامِ۔

''(حاصل مضمون) وہ بزرگوار ۷۸۰ھ میں تلوار سے قتل کئے گئے اور بعد شہادت بے سر جسم کو سولی پر چڑھا دیا اور پتھروں سے سنگسار کیا، پھر نعش مبارک کو نذر آتش کر دیا۔ یہ حادثہ برقوق کی ظلم آفریں سلطنت میں قاضی برہان الدین مالکی اور بعض شافعی علماء کے فتوی سے ہوا، شہید کا قتل قلعۂ شام میں ایک سال تک قید رہنے کے بعد ہوا''[۱]

دشمن کا یہ زلزلہ افگن ظلم زیرِ نقاب نہ رہ سکا اور تمام دنیائے اسلام نے اس استبداد اور بربریت پر نفرین کی۔ وجہ شہادت پر پہنچنے کے بعد صحیفہ کی قدر و منزلت میں چار چاند لگے اور اس وقت کے اہل علم کی نظریں شہید کے ملفوظات اور مخطوطات پر خاص طور پر پڑنے لگیں۔

جناب مرحوم کے شہید ہونے کے بعد علامہ شمس الدین محمد بن علی جبعی کے پاس یہ زریں صحیفہ پہنچا۔ پھر قدرت کو یہ منظور ہوا کہ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ کے کتاب خانہ میں یہ نسخہ ہے۔ اس کے اصفہان تک پہنچنے کی روایت یہ ہے:

''اِنِّی رَأَیْتُ فِی الْمَنَامِ مَوْلَایَ الْحُجَّةَ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَیْهِ وَکَانَ مَعَهُ رَجُلٌ وَعِنْدَهُ کِتَابٌ فَاَمَرَهُ اَن یُّعْطِیَنِی ذَالِكَ الْكِتَابَ فَاَخَذْتُهُ مَسْرُوراً وَفَتَحْتُهُ وَرَأَیْتُهُ فَانْتَبَهْتُ وَ کُنْتُ فَاسِقاً عَلَی الْكِتَابِ حَیْثُ لَمْ اَجِدْ لَهُ اَثَرًا فَصِرْتُ اِلٰی مَشْهَدٍ وَاِنِّی نَسِیْتُ اَیَّ مَشْهَدٍ ذَکَرَ اِذْ قَالَ فَجَلَسْتُ فَرَأَیْتُ رَجُلاً اَقْبَلَ اِلَیَّ وَمَا کَأَنَّهُ الَّذِی کَانَ مَعَهُ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَقَالَ اِنِّی اَرَاكَ رَاغِباً اِلَی الْعِلْمِ وَعِنْدِی کُتُبٌ اَنْتَ بِهَا اَهْلٌ نَعْلِیْكَ اَنْ تَجِی مَعِی وَنَاخُذَ الْکُتُبَ اَنْتَ وَ سِرْتُ مَعَهُ مَسْرُوراً فَاَوَّلَ کِتَابٌ اَعْطَانِی کَاَنَّهُ

[۱] لؤلؤۃ البحرین

الْكِتَابُ الَّذِيْ كَانَ اَعْطَانِي سَيِّدِيْ وَمَوْلَائِي الْحُجَّةُ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ فَلَمَّا رَأَيْتُهُ وَجَدْتُهُ الصَّحِيفَةَ السَّجَّادِيَةَ بِخَطِّ الشَّيْخِ الشَّهِيْدِ الْمَكِّي قُدِّسَ سِرُّهُ۔"[۱]

''مجلسی علیہ الرحمہ کا بیان ہے کہ میں نے اپنے مولا حضرت حجتؑ کو خواب میں دیکھا کہ ان کے ساتھ ایک شخص ہے اور اس کے پاس کتاب ہے۔ امام نے اسے حکم دیا کہ مجھے وہ کتاب دے دے۔ میں نے بڑی خوشی سے وہ کتاب لی اور جلد کھول کے صفحات دیکھے، جب بیدار ہوا تو کتاب کا کوئی وجود نہ تھا اور مجھے بڑا افسوس تھا، حتیٰ کہ میں روضہ امام کی زیارت کے لئے مشہد پہنچا اور ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ گویا وہی شخص آتے ہوئے نظر آیا اور میرے پاس پہنچ کر کہا کہ میں آپ کو علم کی طرف راغب پاتا ہوں اور میرے پاس کچھ کتابیں ہیں جن کے آپ ہی اہل ہیں، لہٰذا آپ میرے ساتھ چل کر کتابیں لے لیں، میں اٹھا اور بصد مسرت اس کے ساتھ راستہ طے کیا، پہلی کتاب جو اس شخص کے ہاتھ سے مجھ کو ملی وہ وہی کتاب تھی جو میرے سید و آقا حضرت حجتؑ نے خواب میں دی تھی۔ جب میں نے کتاب کو وا کیا تو صحیفۂ سجادیہ تھا، شہید اول کے دست مبارک کا لکھا ہے''

استاذ الکل فی الکل جناب غفران مآب علیہ الرحمہ جب تکمیل علم کے بعد وطن تشریف لائے تو یہ صحیفہ عتبات عالیہ سے حاصل کر کے لکھنؤ لائے اور کمال عزت و احترام کے ساتھ اپنے کتب خانہ میں محفوظ کیا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں لکھنؤ کی لوٹ کے وقت حافظ حقیقی نے اس صحیفہ کو بچایا اور جناب سلطان العلماء سید محمد صاحب رضوان مآب طاب ثراہ اس کو جان کی

طرح عزیز رکھتے تھے۔ ان کے حقیقی بھتیجے جناب ممتاز العلماء فخر المدرسین جنت مآب علیہ الرحمہ نے جب اپنے کتب خانہ کی بنیاد قائم کی، توشفیق چچا سے خواہش کی کہ صحیفہ عنایت کر دیا جائے۔ سلطان العلماء کی دوررس نگاہیں زمانہ کے نشیب وفراز سے بہت زیادہ آگاہ تھیں مگر بھتیجے کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے مستقبل کے خطرات سے خبر دیتے ہوئے صحیفہ دے دیا اور رقعہ میں یہ لکھا:

"دربارۂ صحیفۂ شہید کہ از عمدۂ تبرکات زمانہ والدم طاب ثراہ است از شما دریغ ندارم لکن بخیال اینکہ بسبب توسیع دائرہ حضرات کشا مرہ و تسلط وعاۃ و بغاۃ مثل میر محمد شاہ وغیرہ مبادا از کجا بکجا رسد وخدا نکردہ تبرکات از دست رود و تاسف وتلہف دارم والا زشما عزیز ترے ندارم"[1] (۱۳)

اس وقت سے یہ صحیفہ جناب ممتاز العلماء طاب ثراہ کے کتب خانہ میں رہا اور جناب ممدوح نے اپنے قلم سے صحیفہ کے جو حالات لکھے اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"تِلْكَ الصَّحِيْفَةُ الْآنَ عِنْدِی مِن خَزَانَةِ كُتُبِ جَدِّیَ الْعَلَّامَة اَعْلَی اللهُ مَقَامَهُ وَهِیَ اَعَزُّ عِنْدِی مِنْ نَفْسِی وَنَقَلْتُ الدُّعَآءَ مِنْ خَطِّهِ الشَّرِيْفِ وَاَعْرَبْتُ اَيْنَمَا كَانَتْ مَعْرِبَةً فِی تِلْكَ النُّسْخَةِ الشَّرِيْفَةِ بِالْحُمْرَةِ وَفِيْمَا عَدَا تِلْكَ الْمَوَاضِعَ بِالسَّوَادِ"[2]

"وہ صحیفہ میرے پاس اس وقت بھی موجود ہے، میں اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور دعائے سمات کو شہید ہی کے قلم سے نقل کرتا ہوں۔ جہاں جہاں سرخی (شنگرف) سے اعراب ہیں وہاں زیر زبر سرخ قلم سے دیئے ہیں اور باقی مقامات

[1] ص:۳۹۷، احیاء الآثار قلمی
[2] الدعواۃ الفاخرہ

HAZRATGHUFRAAN MA’AB (R.H)

BY

ZUBDATUL ULAMA, MAULANA SAYYID AAGHA MAHDI LUCKHNOWI, KARACHI PAKISTAN

PUBLISHER
DIGITAL LIEBRARY OF NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
IMAM BARA GHUFRAAN MAAB, MAULANA KALBE HUSAIN ROAD, CHOWK, LUCKNOW,226003(UP)INDIA
PHONE-0522-2252230,08736009814
EMAIL:noorehidayat@gmail.COM
WEBSITE:www.noorehidayatfoundation.org